ہندوستانی فارسی ادب:۔ از پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپیے، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۳۸، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی فارسی زبان و ادب کے متبحر عالم ہیں، انھوں نے فارسی زبان و ادب کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ اس موضوع پر سینکڑوں علمی ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اب ان کے شاگرد اور رفیق کار ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے زیر نظر مجموعہ میں ان کے مقالات کا انتخاب شایع کیا ہے، یہ چودہ مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں فارسی زبان و ادب کی ترویج و توسیع میں ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے، یہ مضمون گو مختصر ہے مگر اس میں زیر بحث موضوع کی اکثر ضروری اور اہم باتوں کا تذکرہ ہے، اور شروع سے اب تک فارسی زبان میں ہونے والے کاموں کا اجمالی جائزہ بھی ہے، اس سلسلہ میں اہم مؤلفین اور مؤلفات کے نام بھی گنائے گئے ہیں، مگر اس مقالہ میں یہ معمولی کسر رہ گئی ہے کہ مرزا غالب کے بعد کے فارسی گو شعرا میں ڈاکٹر اقبال اور اقبال سہیل کا تو تذکرہ ہے مگر علامہ شبلی اور بعض دوسرے فارسی گو شعرا کا ذکر رہ گیا ہے، دوسرے مقالہ میں فردوسی کے شاہنامہ کی فارسی زبان و ادب میں اہمیت دکھانے کے بعد ہندوستان میں اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اس سے والہانہ شغف کا حال بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں شاہنامہ کے مختلف قلمی نسخوں کا ذکر بھی کیا ہے، تیسرے مضمون میں سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے جانے والے تحریری کاموں کا وقت نظر سے جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ہندوستان کی اہم مصنفات فارسی زبان و ادب کے خدمت گذاروں کی سرگرمیوں کا خاص محور رہی ہیں، چوتھے مضمون میں امیر خسروؒ کی مثنوی تغلق نامہ کے تکملہ کے متعلق جناب ہاشمی فریدآبادی کے اس خیال کی دلائل سے تردید کی ہے کہ تکملہ نگار حیاتی کاشی کے بجائے حیاتی گیلانی تھا، چند مضامین میں بعض شعرا اور اہم تصنیفات کا پہلی مرتبہ مفصل تعارف کرایا گیا ہے، ایک مضمون میں اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کے فارسی رسائل اور شاعری پر بحث کی ہے، جدید فارسی زبان و ادب سے متعلق بھی دو محققانہ مضامین درج ہیں "ایران کا سماجی اور انقلابی ادب" اور "ایران کا نیا دگذار شعر" یہ سب مضامین عابدی صاحب کی تلاش و جستجو اور تحقیق کا نتیجہ ہیں، اور ان سے فارسی زبان و ادب سے ان کی شیفتگی کے علاوہ اس میں گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے، یہ مجموعہ فارسی زبان و ادب کے شیدائیوں کے لیے خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ترقی اردو بورڈ کراچی کی طرف سے اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی پانچ جلدیں اس وقت پیش نظر ہیں، جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی عنایتوں سے دارالمصنفین کو بھیجی گئی ہیں۔

پاکستان میں ۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ قائم ہوا، جس کی اور علمی سرگرمیوں کے ساتھ اس کے ذمہ یہ کام بھی سپرد کیا گیا تھا کہ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کے نمونے پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین ہو، اس کے لیے مجلس اعلیٰ مجلس انتظامی اور علمۂ ادارت قائم ہوئے، اس کی مجلس اعلیٰ کے صدر جناب ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم تھے، ارکان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بھی تھے، اور اس کے مدیر اعلیٰ و معتمد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) ہوئے، اس کی مجلس انتظامی کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم تھے، پاکستان کے تمام قابل ذکر دانشور اس کی تدوین میں شریک کیے گئے، اس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں شایع ہوئی، اس کے شروع میں جناب محمد ہادی حسن صدر ترقی اردو بورڈ کا تعارف ہے، پھر اردو لغات اور لغت نویسی کے عنوان سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک تحریر ہے، اور اس کے بعد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک بہت ہی طویل، پرمغز اور سیر حاصل مقدمہ ہے، جس میں اردو زبان کے مختلف ادوار کی تاریخ بہت ہی امعان نظر کے ساتھ سمیٹ کر پیش کی گئی ہے۔

اس میں لغت نویسی کے یہ اصول رکھے گئے ہیں کہ زبان کا ہر لفظ، ترکیب اور محاورہ جو اس کا جزو ہے خواہ آج بولا جاتا ہے یا متروک ہو چکا ہے، یا زبان میں نیا نیا داخل ہوا ہے، خواہ وہ روزمرہ بول چال کا ہو یا کوئی علمی یا فنی اصطلاح ہو، اسے لغت میں شامل کرنا چاہیے، اصطلاحات کے معاملہ میں انتخاب کا کوئی خاص اصول نہ ہو، البتہ جدید علوم و فنون کی جو اصطلاحیں اب عام ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں ان کو اس لغت میں شامل کرنا چاہیے، اسی طرح خاص مقامی الفاظ یا محاورے جو اردو میں شامل ہو گئے ہیں اور اردو کے معیاری اور مستند ادب یا بول چال میں آگئے ہیں یا آرہے ہیں، ان کو بھی اس لغت کا جزو ہونا چاہیے، اس کے بعد یہ شرط بھی رکھی گئی کہ ہر لفظ کے

متعلق یہ بتایا جائے کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا، اور اس وقت سے تاحال اس کی شکل صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوا؟۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اصول رکھا گیا کہ ہر لفظ کے تحت اس میں عہد بہ عہد بدلی ہوئی صوتی یا معنوی تبدیلیوں کی بھی نشان دہی ہو، اس کے لیے قدیم و جدید مصنفین کے قلمی اور مطبوعہ ذخیرۂ تصنیف و تالیف سے مدد لی جائے، پھر ہر لفظ کی تشریح سندوں اور مثالوں سے ہو، مترادفات کا کوئی خاص وجود تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ بعض الفاظ میں معنی کے چند اجزا مشترک ہوتے ہیں، ورنہ ہر لفظ نہ صرف معنی کے اعتبار سے بلکہ محل استعمال اور سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی منفرد ہوتا ہے، پھر اس کا بھی خیال ہو کہ اردو زبان کے لغات میں سنسکرت، پراکرت، عربی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے علاوہ برصغیر کی آریائی زبانوں اور مقامی بولیوں کے جو الفاظ شامل ہیں، ان سب کی اصل کی تلاش دستیاب ہونے والے ماخذوں سے اچھی طرح ہو۔

ان ہی اصولوں کے ساتھ اس لغت کی تدوین جاری ہے، ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی، لفظ ادیب کے ساتھ بریکٹ میں پہلے فت (ا ی ب) لکھا گیا ہے، اس کے بعد صف ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ الف پر فتحہ یعنی زبر ہے، ی معروف سمجھی جائے، اور پورا لفظ صف یعنی صفت قرار دیا جائے، پھر اس کے معنی علم ادب و لغت کا عالم، زبان دان، نظم و نثر اور ان کے متعلقات کا ماہر بتایا گیا، سند میں مومن کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

مرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ مند ادیب و نبض شناس و منجم و فاضل

پھر نثر میں اردو کے ایک لازمی نصاب سے یہ جملہ نقل کیا گیا ہے: "ان کے والد اور دادا فارسی اور اردو کے پرگو شاعر اور ادیب تھے"۔ پھر اس لفظ کے یہ معنی بھی بتائے گئے ہیں: معلم، استاد، اتالیق، ادب اور تہذیب سکھانے والا، سند میں ایک شعر سودا کا اور دوسرا شعر ریاض البحر سے پیش کیا گیا ہے ؎

دیکھ کر تیور مرے طفلی میں کہتا تھا ادیب ایک دن مجنوں صفت یہ سر بصحرا ہوئے گا

انسان پر کھلے جو نصیحت کا ذائقہ — نعمت سمجھ کے کھائے طمانچہ ادیب کا

پھر نثر میں یہ جملہ درج کیا گیا ہے کہ "دادا بھائی کا رتبہ ایک ادیب کا ہے، جو ..... فرماں روایانِ ملک کو بھی سبق دے سکتے ہیں" پھر اس لفظ کے معنی انشا، پرداز اور ادبی مضامین اور مقالے لکھنے والا، اور نثر نگار بھی بتائے گئے ہیں، مثالیں نذیر کے لیکچروں کے مجموعہ کے دیباچہ اور سیف و سبو کے مقدمہ سے دی گئی ہیں: "ضرور نہیں کہ جو بڑا انشی یا ادیب ہو وہ بڑا لیکچرار بھی ہو۔ یہ آج کل کا وہ مروج طرزِ نقد ہے جس میں ناقد ادیب و شاعر سے تقریباً بے نیاز ہو کر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے۔"

اس میں ساری کہاوتوں کی بھی تشریحات ہیں، اچھیا پچھیا، اچھن بچھن، اچلا چال، اجل بجل جانا، اج کے بجے کرنا، اور ابرن سبرن، وغیرہ جیسے روزمرے کی بھی تصریحات کر دی گئی ہیں۔

ابارنا، ابارکی، ابارپا، اباریر، ابارپری، ابدح، ابدھوت، ابرنا، ابوجک اور اپار وغیرہ بھی اردو کے الفاظ قرار دیے گئے ہیں۔ انگریزی الفاظ میں ایڈنٹ، اٹامیت، پرابلم، پراپرٹی، ایجوکیشن اور اٹمروبیت وغیرہ بھی اس لغت میں شامل کر لیے گئے ہیں، عربی الفاظ میں اتساد، اتساع، اتکار، اتمم آثارت، امتحان، اجراف اور ابتلاع وغیرہ بھی اردو ہی کے سمجھے گئے ہیں، اور ان کے لیے سندیں پیش کی گئی ہیں، اس طرح اردو کے الفاظ کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔

پہلی جلد الف مقصورہ سے شروع ہوئی تھی، پانچویں جلد ت مسلسل پر ختم ہوئی ہے، اب تک اس کے پانچ ہزار سات سو چوبیس (۵۷۲۴) صفحات ہو چکے ہیں، معلوم نہیں ابھی کتنی جلدیں اور ہوں گی، اور کتنے صفحات اور درکار ہوں گے، جس عرق ریزی، مستعدی اور تن دہی سے یہ عظیم الشان کارنامہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں انجام پایا ہے، اگر وہ جہانگیری اور شاہ جہانی دور میں ہوتے تو یقیناً سونے میں تلوا دیے جاتے، ترقی اردو بورڈ کی اس پیش کش کے بعد اردو زبان اب دنیا کی عظیم ترین زبانوں کی صف میں آ جائے گی، اس کے لیے بورڈ ہر طرح کی مبارکباد کا مستحق ہے۔

مقالات

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون
اور
مستشرقین

از مولانا ابو الکلام آزاد

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے رسالہ الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ایک مضمون لکھ کر مستشرقین کی خدمات کو سراہا ہے، اس کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں، امید ہے کہ یہ تحریر دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ "ص ۔ ع"

"مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابلِ شرم ہے، کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں، عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم و فنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے، کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کو الگ کر دینے کے بعد عربی کا

اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کچکول خالی ہوجاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سو آج دنیا میں نظر آرہی ہیں، صرف یہی نہیں، کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہوگئے، بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان لغت، صرف، نحو، عروض، اور قوافی کے متعلق جیسی کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں، کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبان میں آجائے، تو بیش بہا معلومات سے ہم مالامال ہوجائیں۔

ڈاکٹر لائٹز ہماری اس افسوسناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں، کہ مسلمان ہیں تو بہت مگر وہ جانتے کیا ہیں، اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان، درکار ہو، تو یورپ سے مانگنا پڑے گا، ابن خلدون، ابن رشد ابن بطوطہ حاجی خلیفہ، ابن اثیر، اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں، تابط شرا، امراؤ القیس بحتری، اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا، یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں، اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں،

ڈاکٹر لائٹز کو تو صرف اس کا افسوس ہے، کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے، کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں، اور انھیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں، کہ اس مضمون کے ذریعہ علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں۔

جن کی بدولت آج انھیں، اس امر کا موقع حاصل ہے، کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یہ دکھلایا ہے، کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی، اور صرف و نحو، لغت و ادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں، دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں،

(ابو الکلام)

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی، اور کیونکہ ہوئی، یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے، جس کے بیان کرنے کی یہاں نہ گنجائش ہے، اور نہ ضرورت، صرف اس قدر بتلانا، سلسلہ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے، کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا، اور کیونکر عربی علوم و فنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہوگئے، دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے، کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولٹیکل خوں ریزی نے رکھی، جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے، گیارہویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے بلکایک یورپ کو موقع دیا، کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے، بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی، اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہوگئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں، اور مسلمانوں کی شائستگی کا لیے پہلا تجربہ ہوا، شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے، کہ مسلمان علمی و عملی ترقیات کے دنیا میں اکیلے مخزن ہیں، اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ پیدا ہوگئی، اور یہ توجہ

برابر بڑھتی گئی، کیونکہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گذر ہوا، اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے، اس لیے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑہ اٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی، اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور اراکین سلطنت کے لیے مخصوص تھی، اس لیے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اوّل قدم اٹھا، وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے، کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا، اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی، حالانکہ ابتداء میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کو توجہ ہوئی، اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں[1]، ابتداء میں متعدد محکمے قائم کیے گئے، کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کیجائیں، پھر پوپ الکزنڈر ششم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ سے نوجوان طلبہ اندلس روانہ کیے گئے[2]، اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفہ میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لیے یورپ کے طلبہ ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے[3]، جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں، جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تقید سے خود کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ

[1] سیاحۃ المعارف ص ۲۹۷ [2] ایضاً ص ۲۹۷ و ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۲۹۷ و ۳۲۱

مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کر دی، کچھ طالب علم ایسے ہیں، جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے، اور ایک عرصہ کی تلاش وتحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔

ہارڈ مین کرمیون اس زمانہ کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے، یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا، اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹرز مارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیہ کا شوق دامن گیر ہوا، اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی، اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔

ڈانیل مارلی اور پیٹرز ماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی، آخر الذکر نے قرآن شریف کا لاطینی ترجمہ بھی کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی[1]، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں، جن میں بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں[2]، ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لیے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولھویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی، ۱۶۳۲ء میں پندرھویں گری گور

[1] سیاحۃ المعارف ص ۳۰۰ [2] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا۔

پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا، کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہوگئی، اس کے بعد ہی ۱۶۲۷ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پاکر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی و سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے، عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں، تعلیم کے لیے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بکثرت مہیا ہوں، اس لیے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے، اور کچھ کتابیں قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی دستیاب کیں، اور انھیں اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا،

صرف ونحو عربی کی کتابیں جو یورپ میں لکھی گئیں

اس انجمن نے عربی کے لیے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے، جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی، اور پھر صرف ونحو اور ادب ولغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا، ان لوگوں میں پہلا شخص آر. پی. نیو نامی ایک عالم ہے، جو ہالینڈ کا باشندہ تھا، مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی، اور متعدد زبانوں کو حاصل کرکے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی ہوچکی تھی، اس لیے ہالینڈ پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہوگیا، اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہوگئی، اور صرف ونحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا۔[۱] آر. پی. نیو کے بعد لافن دار تر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم ۱۶۱۹ء میں

[۱] سال ولادت ۱۵۸۴ء، اور وفات ۱۶۲۴ء ہے، صرف ونحو کے علاوہ اور تصنیفات حسب ذیل ہیں، عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ، عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق، عہد جدید کا عربی میں ترجمہ، چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا لیکن ان کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

پیدا ہوا، اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی، ۱۶۲۲ء میں مشرقی ممالک کا سفر کرکے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں، اور لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کردیں۔

سترھویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا، لیکن اٹھارھویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا وہ نیا دور شروع ہوا جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنیاد رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سل وسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا، بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا، علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف ونحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں، اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے، کہ جن جن صرفی ونحوی مسائل کو لکھا ہے، ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کردیے ہیں۔[۱]

[۱] اس کا پورا نام ان ٹوان آئزک سیل وسٹر دے ساسی ہے، بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی، اس لیے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی، باوجود اس کے ذہن اس قدر تیز تھا، کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کرلی، بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی، جس کا نام ڈی. ڈگیں تھا، اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا، اور دس برس کی محنت اور مطالعہ سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی، ۱۷۸۰ء میں جبکہ اس کی عمر صرف ۲۰ برس کی تھی، انجیل کے بعض قیمتی مسائل کا پتہ لگایا اور ۱۷۸۵ء میں اکاڈمی آف انسکرپشن (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو دو قابل قدر یادگاریں نذر دیں، ان دو کارناموں نے اس کی شہرت دور دور تک پہنچا دی اور یورپ کی تمام علمی انجمنیں اس کی قدردانی کے لیے آمادہ ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹکل بے چینی پیدا ہوگئی تھی، اور عنقریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی، ۱۷۸۹ء میں یکایک یہ آگ بھڑک اٹھی، اور فرانس میں انقلاب ہوگیا، اس بے اطمینانی کے زمانہ میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا، کچھ عرصہ کی خوں ریزی (بقیہ حاشیہ ص ۳۳۲ پر)

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہوگئے، جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوگئی منجملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے گرچہ مسلمانان ہند کا یہ زمانہ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہانتک کہ لکھنؤ اور دلی کے جو علماء آج زیادہ مشہور ہیں، وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لیے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی، اس توجہ سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے، ان میں ایشیاٹک سوسائٹی

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۱) کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی، تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدردانی کی گئی، اور جنیوا بھیجا گیا، تاکہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے ۱۸۰۶ء میں جنیوا سے واپس آیا، اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ اکاڈمی میں پیش کی۔ پھر ۱۸۰۶ء میں فارسی لٹریچر کا پروفیسر مقرر کیا گیا، اور نپولین اول شاہ فرانس نے بیرن کے عہدہ پر سرفراز کیا، اس عرصہ میں فرانس کی پولٹیکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا، اور ۱۸۱۱ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہو کر نئے سرے سے بوربون قائم ہوئی، اس زمانہ سے دے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے، اول سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا، پھر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا پریزیڈنٹ منتخب ہوا، یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا، دی فلپ کے عہد میں شاہی توجہ پھر مبذول ہوگئی اور شاہی کتب خانہ کے مشرقی حصہ کا محافظ اور اکاڈمی آف انسکرپشن کا لائف سکریٹری مقرر کیا گیا، اسی ممتاز محقق نے منجملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف ونحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی جو پندرہ[۱۵] سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے، اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں اردو سنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور اسی کی تجویز وہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی سال ولادت ۱۷۵۸ء اور سال وفات ۱۸۳۸ء، صرف ونحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں، تذکرہ شعرائے عجم اصول عامہ صرف ونحو اس میں مختلف مصنفین عرب کے کلام نظم ونثر کا انتخاب ہے

بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے، کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دور میں برابر کے شریک ہے، مشہور انگریزی عالم لمزڈن[۱] نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف ونحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شائع کی، اسی طرح کلکتہ میں دو[۲] اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے، جن میں سے ایک رسالہ میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھیں، اور دوسرے رسالہ میں الف لیلہ کے تیسرے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا، اس دور میں صرف ونحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

۱۔ علامہ امی والد جرمنی کی صرف ونحو عربی، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۲ء تک چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی۔

۲۔ علامہ کاسپری کی صرف ونحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی، پھر علامہ آگسٹس نے ترمیم وتہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا، یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی، کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ اڈیشن نکل چکے تھے۔

۳۔ پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسپری کی صرف ونحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو[۲] جلدوں میں مرتب کیا، جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۲) ایک عربی قصہ کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب دروز کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے، اس میں شام کے ایک پُراسرار مذہب کے حالات درج کیے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور نٹیل۔

[۱] اس کا پورا نام لمسڈن میتھیو ایل، ایل، ڈی ہے، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا، عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف ونحو موجود ہے، ۱۸۲۰ء میں ایسٹ انڈیا کی ملازمت ترک کرکے انگلستان گیا، اور علمی مشاغل میں مصروف رہا، ولادت ۱۷۷۷ء وفات ۱۸۳۵ء۔ [۲] وقائع ولیم ناموس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ۔

یورپ کے علماء نے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف ونحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو اون کے لیے مفید ہوں، جب ایسی کتابیں نہیں ملیں، تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں، اور آنے والے زمانہ کے لیے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا، اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے، جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی؟

یورپ نے عربی کے جو لغت ترتیب دیے: سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا، وہ جیجیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے، جو اٹلی کا رہنے والا تھا، پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی، اور ۱۶۵۳ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا، یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے، اس لیے علامہ مانیس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمن دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت کا نام کنز اللغات اشرفیہ ہے، ۱۶۸۰ء میں وائنا دارالسلطنت آسٹریا سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیٹگ نے چار جلدوں میں اور کازمی مرسکی نے فرنچ میں اور باڈجر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کیے، جو ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۳ء تک چھپ کر شائع ہوئے، ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے، کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کیے، اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لیے اپنا مرہون منت بنا لیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتبخانہ میں یہ لغت میری نظر سے گذرا، دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کیے ہیں جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے، کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت طیار ہوا، تاریخ و ادب اور علوم و فنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں، اور جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ ملے، جمع کر لیے، پھر سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق و تنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بہ لفظ درج کیا، پہلی جلد کی ابتدا میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش و تحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے، کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں، اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتہ لگایا۔

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملکی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیے، یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب و لہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے، پروفیسر دوزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے، جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کیے ہیں، اور دکھلایا ہے، کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیونکر اختیار کی، اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی۔

افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں، اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے متعلق تصنیفات: ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے، یورپ نے عربی علم و ادب کے

نہایت مفید منتخبات ترتیب دیے ہیں، اور ان منتخبات میں ادب کی بعض اُن کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں، اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں، اس قسم کی چودہ (۱۴) کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن، اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف و نحو

آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں، یورپ نے دارجہ کے بھی صرف و نحو لکھے ہیں، اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کانس نامی مستشرق نے ۱۸۷۵ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی، اور اسپین میں چھپ کر شائع ہوئی، پھر دو بیسے نے لکھ کر وامتا سے شائع کی، اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ (۱۲) کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے، جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال

صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیے ہیں، مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں، بادجر نے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیے ہیں، ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع "مجموعۂ امثال" ترتیب دیا ہے، جس میں عام الجزیرہ دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف حلقوں میں مشہور ہیں، اور جن سے ان کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے، اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں:

۱- سوسین کا مجموعۂ حکایات جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں، یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

۲- سبی تابیک کا مجموعہ جو ۱۸۹۳ء میں لندن سے چھپ کر شائع ہوا، ۳- لینڈ برگ کا مجموعہ جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی کارناموں پر ایک نظر

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی

کہتے ہیں معاصرت ایک حجاب ہے، جہاں نظارہ بھی نقاب کا کام کرتا ہے، اور شخصیت کتنی ہی دلکش اور عظیم کیوں نہ ہو، اس کے حقیقی خد و خال اور اس کی فکر کے دور رس اثرات معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات کسی شاعر کی حساس روح اس "روبند عصر" کو چاک کر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اور معاصر شخصیت کو اس کی پوری عظمت و شان میں دیکھ لیتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عظمت کا احساس سب سے پہلے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کو ہوا، آنے والی نسلوں نے جو کچھ دیکھا، مرزا صاحبؒ کے حساس دل نے پہلے ہی اس کی جھلک دیکھ لی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی تبحر اور ان کے کارناموں کے عظیم الشان اثرات کا مشاہدہ سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ کی چشم جہاں بین نے کیا، اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

"علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندویؒ کے اور کون ہے؟"

سید صاحبؒ کے علمی کارناموں کی قدر اور ان کی شخصیت کا احترام تو معاصرین کے دل میں پہلے تھا، لیکن کسی نے نہ ان کی صدائے تیشہ سنی تھی، نہ ان کی جوئے شیر کو کسی نے دیکھا تھا، علامہ محمد اقبالؒ کی آواز نے ایک دم سے چونکا دیا، اور معاصرت کے حجاب گرنے شروع ہو گئے، اور ایسا محسوس ہوا کہ

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

سید صاحبؒ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۵۳ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس مدت میں ہندوستان کے سیاسی حالات نے کیا کیا رنگ بدلے، اور وقت کا قافلہ کن کن نازک منزلوں سے گذرا، لیکن "تیشۂ فرہاد" کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، اور اپنی زندگی کا جو مقصد پہلے دن قرار دیا تھا، اس پر آخر تک جمے رہے، بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ تپش اور تابناکی پیدا ہوتی رہی اور ستر سال بعد جب جان جان آفریں کے سپرد کرنے کا وقت آیا تو ان کی تصانیف کے ہزاروں صفحات ان کے عزم کو وہ کن کو خراج تحسین ادا کر رہے تھے، اور ان کی روح زبان حال سے خسروؔ کا یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

ساختہ ام ایں ہمہ لعل و گہر زخوئے پیشانی و خونِ جگر

کتنے ہی بنجر اور غیر ذی زرع میدان تھے، جو ان کی جہد و سعی سے "غزالانِ فکر کا مرغزار" بن چکے تھے اور کتنی ہی گذرگاہیں تھیں جہاں ان کی دوربینی نے روشنی کے مینارے کھڑے کر دیے تھے، جو اعلان کر رہے تھے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ذات مجسم علم تھی، ایسا علم جو پاکیٔ عقل و خرد کا امین اور عفت قلب و نگاہ کا پاسبان ہوتا ہے، انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفقاء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے خدمت علم کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کر دیں، اور ان کے دامن کمال میں بعض بہترین دماغوں نے پرورش پائی، ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ میں ان کے شاگردوں کا کام کوئی دیانت دار مورخ بھلا نہ سکے گا، کسی عالم اور استاذ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز باعث فخر و مسرت نہیں ہو سکتی کہ اس کے شاگرد اس کی جلائی ہوئی شمع سے تاریک گذرگاہوں کو اس طرح روشن کر دیں کہ اس کا نام زمان اور مکان کی قیود سے بے نیاز ہو جائے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنا علمی سفر اس منزل سے شروع کیا جہاں مولانا شبلیؒ نے اپنا رخت سفر کھولا تھا، وہ چند سے مقیم "آستان غیر" رہ کر آستانۂ نبوت پر پہونچے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے کام کا آغاز ہی وہاں سے کیا، شفیق استاد نے اپنی علمی زندگی کا حاصل ان کے سپرد کیا، اور اس کام کی تکمیل کی ہدایت کی جس کے متعلق خود کبھی کہا تھا ؎

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حالِ سرورِ عالمؐ دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالمِ قدوس سے آئی کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

کس قدر مشکل تھا یہ کام اور کتنی بڑی تھی یہ ذمہ داری، جو ان پر ڈالی گئی تھی، لیکن ان کے بے پناہ خلوص، غیر معمولی جذبۂ شفقت اور مقصد کی مثالی لگن نے اس بار امانت کو اس طرح اٹھایا کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ گئے، استاد کی تمنا پوری ہوئی، اور انھوں نے سیرۃ کو قرآن کی روشنی میں اس طرح پیش کیا کہ عالم قدوس کی بانگِ قلم اس میں سنائی دینے لگی، علامہ محمد اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہمیشہ ذات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رہی، اپنے شیخ کو ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ سیرۃ نبویؐ میں مصروفیت نے ذات نبویؐ سے ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے، یہ جذبۂ محبت ان کی تصانیف میں خون زندگی کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف نے اسی سے آب و رنگ حاصل کیا ہے، ارض القرآن، سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ، سیرۃ عائشہؓ، اس کا تتمہ، عربوں کی جہاز رانی، صاحب سیرتؐ کی تعلیم کے اثر و نفوذ کو سمجھنے کی کوشش، عرب و ہند کے تعلقات دیار رسولؐ سے اپنا رشتہ جوڑنے کا جذبہ، سیرت امام مالکؒ، روح حجازی سے قریب پہونچنے کی بے چینی، ہر کام میں عشق رسولؐ پکارتا سنائی دیتا ہے کہ ع بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں علماء و فضلاء کی کمی نہ تھی، شاید ہی کوئی فن ہو جس کے مشاہیر موجود نہ ہوں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ہر فن کے مشہور استاد یہاں موجود تھے، لیکن سیرۃ النبیؐ کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کی سعادت مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کے لیے مقدر تھی، انھوں نے جو بھی علوم حاصل کیے تھے، انھیں اس

کام میں صرف کر دیا، وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے ؎

ملال عالمیاں دم بہ دم دگرگون ست
منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

سید صاحبؒ کا سب سے پہلا مقالہ جو مدینہ کی "انجمن الاصلاح" میں پڑھا گیا تھا، "علم اور اسلام" پر تھا، (بعد کو یہ مضمون علی گڑھ منتھلی میں شائع ہوا) ان کا سب سے پہلا مضمون "وقت" پر تھا، جو لاہور کے رسالہ "مخزن" میں چھپا تھا، یہ سب اتفاقات سے زیادہ فطرت کے خاموش اشارے تھے کہ ان کی جدوجہد کا محور اسلام، علم اور وقت کے تقاضوں کی تشخیص ہوگا، انھوں نے اپنی ساری زندگی ان ہی تینوں کی خدمت میں بسر کی، وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی علم اور اسلام کی خدمت کے مترادف تھا، اور شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول کبھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوا:

"نصیحت دیگر خواہی مسلماناں در ہر زماں و در ہر مکاں رنگے دیگر دارد، و اقتضائے دیگری نماید، و لہٰذا علمائے دین و کبرائے اہل یقین در تفسیر و حدیث و عقائد و فقہ و سلوک تصانیف متنوعہ ساختہ اند، و تو الیف گوناگوں پرداختہ" (دیباچہ فتح الرحمن ص ١)

"مخزن" اور "علی گڑھ منتھلی" میں ان کے سب سے پہلے مضامین کا چھپنا بھی معنی خیز تھا، آنے والے وقت میں ان کے علمی تبحر سے جدید اور قدیم دونوں علوم کے ماہرین کو مستفید ہونا تھا، سر عبدالقادر نے بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "مخزن" میں جدید و قدیم ادب نوازوں کو ایک میز پر جمع کر دیا تھا، جو آواز وہاں سے اٹھتی تھی وہ قدیم اور جدید دونوں ایوانوں میں سنائی دیتی تھی سید صاحبؒ طبقۂ علماء میں شاید پہلے شخص تھے جن کی علمی کاوشوں کو جدید اور قدیم دونوں مکتب خیال کے لوگوں نے یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھا، اور ان کی تحقیق کی ندرت، فکر کی جودت اور دلائل کے استحکام کا لوہا مانا، ان کے الندوہ کے بعض مضامین اشتراکیت اور اسلام، مسئلۂ ارتقاء، قیامت وغیرہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے بعض مسائل پر غور و فکر ابتدائی زمانہ ہی سے شروع کر دیا تھا۔

یوں تو مولانا سید سلیمان ندوی کی پچاس سال سے زیادہ پھیلی ہوئی علمی زندگی میں صدہا کتابیں اور

مصنف ایسے ہوں گے جن سے ان کے نظریات اور رجحانات نے اثر قبول کیا ہوگا، لیکن ان کی فکر کی بنیاد دو کتابوں پر تھی، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان جس سے گہرا قلبی اور ذہنی تعلق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا، دوسرے امام مالکؒ کی موطا جس سے شاہ ولی اللہؒ کی طرح انھوں نے روح حجازی کو سمجھنے کا کام لیا تھا، "حیات امام مالکؒ" اس لیے نہیں لکھی گئی تھی کہ مولانا شبلیؒ "النعمان" لکھ چکے تھے، بلکہ اس کے پیچھے اجتہاد کی اس روح کو بیدار کرنے کا جذبہ کام کر رہا تھا، جس کی نشان دہی شاہ ولی اللہؒ نے اس طرح کی تھی:

"بیقین معلوم شد کہ طریقۂ اجتہاد امروز مسدود نیست، الا از یک وجہ کہ موطا را پیش گیرند" (المصفیٰ)

راہ اجتہاد میں موطا ہی ایک چشمۂ نور تھا جس کی روشنی میں فکر کا قافلہ آگے بڑھ سکتا تھا، سید صاحبؒ نے اس کے ذریعہ اس ماحول سے اپنا ذہنی ربط قائم کیا جس میں اسلامی فکر اور اداروں کی نشو و نما ہوئی تھی حضرت مرشد تھانویؒ کو ایک خط میں اعتزال سے سلفیت تک اپنے ذہنی سفر کا حال بتا کر امام مالکؒ کے اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنے کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے خرمن کمال سے خوشہ چینی ضرور کی لیکن اپنی منزل اور محل کا نشان ہمیشہ امام مالکؒ ہی سے پوچھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذہن کی تربیت مولانا شبلیؒ نے کی اور دل کی پیر تھانویؒ نے، یہ دو جلیل القدر ہستیاں ہیں جنھوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے حلقۂ فکر میں وقت کی رفتار پر اپنا نقش چھوڑا ہے، سید صاحبؒ کی علمی بصیرت کی یہ کرامت ہے کہ استاد اور پیر کے درمیان فکری خلیج کو اس طرح پاٹ دیا کہ بُعد کا گمان ہی ختم ہو گیا، مولانا شبلیؒ کی مسند علم اور پیر تھانویؒ کے سجادۂ مشیخت دونوں کو ان سے رونق حاصل ہوئی، ایک نے اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا، دوسرے نے اپنا عصا ان کے ہاتھ میں دیا، نغانی کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

مسیحا یار و خضرش رہنما و ہم عناں یوسفؑ
نغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

علم و عرفان کا یہ نادر الوجود سنگم، ہماری ذہنی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے تحقیقی اصولوں اور علمی

طریقۂ کار پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

(۱) سید صاحبؒ کا احاطۂ علم اور دائرۂ معلومات بہت وسیع تھا، وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے، جس سے علم و عرفان کی شعاعیں پھوٹتی تھیں، جس موضوع پر گفتگو کرتے ٹھہر ٹھہر کر، سمجھا سمجھا کر سننے والے پر "فنا و سامعہ در موجۂ کوثر و تسنیم" کا عالم طاری ہو جاتا، ان کی گفتگو میں اس سمندر کی خاموش روانی تھی جس کی تہ میں موتیوں کے خزانے بھرے ہوں قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، چاروں کا گہرا مطالعہ علیحدہ علیحدہ کیا تھا، پھر ان سب کو مربوط کر کے حکمت دین کی اکائی میں ڈھال دیا تھا، ان علوم کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ وہ علمی شخصیت کا جزو بن جائیں ان کا امتیازی وصف تھا، وسیع مطالعے، مستحضر علم اور قوی حافظے نے ان کی علمی شخصیت کا وقار بہت اونچا کر دیا تھا،

(۲) سید صاحبؒ نے جمع مواد کو تحقیقی کام کی اساس اور بنیاد قرار دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر تمام نظریات خام اور نقش ناتمام رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہیں، کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے وہ سارے متعلقہ لٹریچر کو کھنگال ڈالتے تھے، ایک اہم بات ان کی تصانیف کے سلسلہ میں یہ ہے کہ ان کی کوئی تصنیف ایک وقت میں مرتب نہیں ہوئی، وہ برسہا برس مواد جمع کرتے رہتے تھے، پھر اس موضوع پر اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لاتے تھے، عرب و ہند کے تعلقات جیسے موضوع کو بیس بیس پچیس پچیس سال تک اپنے ذہن میں رکھا، اور جہاں سے بھی معلومات حاصل ہوئیں ان کو نوٹ کر لیا، اصطرلاب پر ان کے مضامین تاج محل کے معماروں سے متعلق ان کی تحقیق، خلافت اور ہندوستان کے تعلقات پر ان کی تفصیلات مدت کے غور و فکر، اور جہد و سعی کا پتہ دیتے ہیں، وہ انگریزی کتابوں کے معلومات کو بھی ذہن میں رکھتے تھے، اور مستشرقین کے افکار و نظریات پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے، سید صاحبؒ کے دو اصول تھے جو آج بھی اہل قلم کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں: (۱) وہ اپنی تصنیف کا مواد بڑی محنت سے اور مدتوں جمع کرتے رہتے تھے، (۲) جب مسودہ تیار ہو جاتا تھا تو اسکو کچھ دنوں کے لیے دراز میں رکھ کر بھول جاتے تھے، یہ بات خود

انھوں نے راقم الحروف کو بتائی تھی، اس طرح کچھ عرصہ بعد جب مسودہ نکالتے تو خود اپنے ناقد بن جاتے تھے، اور عرفی کی اس ہدایت پر عمل کرنے لگتے تھے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا   یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

اس طرح عبارت اور دلائل کا توازن جو وقتی انہماک میں کبھی کبھی برہم ہو جاتا ہے، اس کو بڑی نفاست اور خوش اسلوبی سے صحیح کر دیتے تھے، ان کی تصانیف میں خیالات کے توازن کا بڑا سبب یہی اصول تھا۔

(۳) مولانا سید سلیمان ندویؒ ماخذ کی تلاش میں بڑی صعوبتیں برداشت کرتے تھے، انھوں نے صدہا ذاتی ذخیرے اور درجنوں پبلک لائبریریاں ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں دیکھی تھیں، جب لندن میں تھے تو وہاں بھی کافی وقت کتابوں کے مطالعہ اور تلاش میں صرف کیا، لکھتے ہیں: "اس عمارت میں جہاں سینکڑوں حقیقی اور مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری... ہندوستان کی علمی تاریخ کا مجسمہ ہے" (معارف جون ۱۹۲۰ء ص ۴۰۸) پھر جب اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست دیکھی تو اس طرح اپنے تعجب کا اظہار کیا: "اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل علم کا برابر کا ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا" (ص ۴۰۱) یہ الفاظ ۱۹۲۰ء کے ہیں۔

ان کا دستور تھا کہ کتب خانوں کی سیر خود کرتے، اور جب واپس آتے تو ناظرین معارف کو اس کی سیر دکھاتے، اس سلسلہ میں گو مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ کی مساعی اپنے عہد کے مشرقی اور مغربی علوم کے سب ماہرین سے بڑھ گئی تھیں، لیکن سید صاحبؒ بھی ماخذ کی تلاش میں بڑی جدوجہد کرتے تھے، نزہۃ الخواطر اور عرب و ہند کے تعلقات فراہمی مواد کا ایسا شاہکار ہیں جن سے ہندوستانی علماء کا سر اونچا ہو گیا ہے،

(۴) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو تصنیف و تالیف کے کام میں کسی طرح کی سہولت پسندی گوارا نہیں تھی؛

دوسروں کی نکالی ہوئی راہ پر چلنے سے بچتے تھے، اور اپنا راستہ خود نکالتے تھے، خواہ اس میں ان کو کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، ان کا مسلک یہ تھا:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

ایک بار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر تحقیقی کام میں دشواری کا ذکر کیا تو فرمایا کہ دشوار گذار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقفیت ہو سکتی ہے، لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ کمال ہے کہ تصنیف و تالیف میں اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود کہیں آبلہ پائی کی شکایت یا تھکن کا اثر ان کی تحریروں میں محسوس نہیں ہوتا، پڑھنے والوں کو ان کی محنت کے ثمر تو نظر آتے تھے لیکن جس طرح وہ خون جگر سے اس کشت ویران کی آبیاری کرتے تھے، بہت کم لوگ اس کو دیکھ سکتے تھے،

(۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ مسائل فقہ پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، وہ عصری رجحانات پر غور و فکر کرتے تھے، اور مسائل پر رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط اور تدبر سے کام لیتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ نے جب بھی فقہی مسائل پر ان کی رائے معلوم کی، ان کے جوابات کو نہ صرف شافی پایا، بلکہ ان میں فکر کی نئی روشنی محسوس کی، اجماع، قیاس، نص، ناسخ و منسوخ وغیرہ پر اقبالؒ نے ان کے خیالات سے استفادہ کیا، اور شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کے بعض اجزاء کا مفہوم بھی ان سے سمجھا، علامہ اقبالؒ نے Reconstrection of Religeos Theught in Islam میں جس انداز سے بعض مباحث کو اٹھایا ہے، اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کا اثر محسوس ہوتا ہے، بعض جگہ علامہ محمد اقبالؒ کی فکر اجتہادی منزلوں کو قطع کرتے کرتے ایک دم سے رک گئی ہے، ممکن ہے کہ سید صاحبؒ ہی نے بعض مسائل میں ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکا ہو، علامہ محمد اقبالؒ کی نظر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی عادت کے خلاف سید صاحبؒ کے مکتوبات کو بڑی حفاظت سے رکھتے تھے، (اقبال نامہ، ج ۱، ص ۱۴۶)

بھوپال ان کی مجتہدانہ فکر کے سفر میں ایک منزل تھی؟ افکار کو عملی جامہ پہنانے کی، اپنی راہ سے ہٹنا مقصود نہیں تھا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں بھوپال سے لکھتے ہیں، یہاں بھی بفضل الٰہی کچھ دینی کام انجام پا رہے ہیں۔" (فاران اپریل ۱۹۵۴ء ص ۲۸)۔

(۶) عالم اسلام کی تحریکوں اور فکری رجحانات سے باخبر رہنے کے لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ بڑی جستجو کرتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا تھا، مفتی عالم جان کی تحریک کی نوعیت پر علامہ محمد اقبالؒ نے سید صاحبؒ کی رائے دریافت کی تھی، افغانستان میں قدیم و جدید نظریات کے تصادم کو خود انھوں نے دیکھا تھا، ترکی کے اصلاحی رجحانات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور گو تحریک خلافت کے پس منظر نے اس کام کو مشکل بنا دیا تھا، وہ کھلے دماغ سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، قیام لندن کے زمانہ میں شامی، مصری، تونسی علماء سے طویل گفتگوئیں رہی تھیں، مفتی اعظم فلسطین اور وہ خود موتمر عالم اسلامی کے نائب صدر منتخب کیے گئے تھے، وہ اس ذہنی اور فکری ہیجان سے پوری طرح واقف تھے، جو اسلامی دنیا میں برپا تھا، ویسے عالم اسلام کی تحریکوں، دینی رجحانات، عوامل و نظریات کا جو براہ راست مطالعہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے کیا ہے وہ کسی دوسرے ہندوستانی عالم کو میسر نہیں آیا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگاہ نے بھی ان اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عرب ممالک میں اس وقت پیدا کر دیے تھے، ایک خط میں ۲۴ر جنوری ۱۹۵۰ء کو مولانا سید سلیمان ندویؒ ان کو حجاز کے تجربات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"بے شبہ جو چیز آپ کے لیے آثار سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ [illegible] سال گذرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا، بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔"

(۷) سید صاحبؒ کی علمی خصوصیات کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ انھوں نے مغرب کے علمی رجحانات اور سائنس کے انکشافات سے اپنے آپ کو بے خبر نہیں رکھا تھا، سائنسی ایجادات پر وہ کھلے دماغ سے غور کرتے تھے، اور

ان کے اثرات کا جائزہ لیتے تھے، انکے رسالہ معارف کے صفحات اخبار علمیہ کے عنوان سے نئے اور اہم معلومات سے بھرے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر جون ۱۹۲۰ء کا معارف لے لیجیے، اس میں سر جے۔سی۔بوس اور رامانجم کی تحقیقات علمی کا ذکر ہے، رامانجم کی جواں سال موت پر غم

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

کہہ کر رنج کا اظہار کرتے ہیں، مانچسٹر یونیورسٹی میں چندہ جمع کرنے کی تدابیر کا ذکر تعجب سے کرتے ہیں، یورپ میں ریویو نگاری کے اصول پر بحث کرتے ہیں، نائٹروجن کے متعلق جدید تحقیقات کا ذکر کرتے ہیں، ڈاکٹر آگسٹن والر ڈاکٹر رابرٹ بل، پروفیسر میکسول لی ڈرائے کی تحقیقات سے روشناس کراتے ہیں، Radiographic ——— Cancer Machine کی ایجاد کی خبر دیتے ہیں، نیویارک میڈیکل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر فنیک کے لیکچرس کا تذکرہ کرتے ہیں، کرۂ ارض اور کرۂ مریخ سے متعلق سائنس کی تحقیقات بیان کرتے ہیں، ڈاکٹر ولیم کے رصدخانے کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں، یہ ایک مہینے کے معارف کے معلومات کا حال ہے، بعض اوقات عالمی علمی رفتار میں اس دلچسپی کو دیکھ کر ذہن ان عوامل و اسباب کے تجزیہ کی تلاش کرنے لگتا ہے، جن کے باعث یہ رجحانات کسی ثمبت نتیجہ پر نہ پہونچ سکے، اور مغربی اور مشرقی علوم کے درمیان کوئی پل نہ بنایا جاسکا، مولانا سید سلیمان ندویؒ مغربی علوم کے نظریات سے واقفیت کو بقول اقبالؒ "بولہب را حیدر کرار کن" کام لیتے تھے۔

(۸) سید صاحبؒ اسلامیات کے سلسلہ میں ہندوستانی یونیورسٹیوں اور طلبہ کے اس طریقۂ کار کو کہ مستشرقین کی کتابوں کو بنیاد بنا کر تحقیق کی جاتی ہے، بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے خاص طور پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، میکڈونالڈ (Mac Donald) کی Development of Muslim Theology jurisprudence and Constitutional Theory ———، Aghnides (Hughes) کی Dictionary of Islam اور کی Mohammadan Theories of Finance کا ذکر کیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح نہ صرف

مستشرقین کی غلطیاں دہرائی جاتی ہیں، بلکہ تحقیقی زاویے محدود ہو کر رہ جاتے ہیں، اور اسلامی فکر اور اداروں کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کی صلاحیت مردہ ہو کر رہ جاتی ہے،

(۹) مولانا سید سلیمان ندویؒ خود کو "سرتاپا مشرقی درسگاہوں کا پروردہ اور نمایندہ" (مقالات ص ۳۸) کہتے تھے اور یہ صحیح بھی تھا، لیکن ان کا انداز بیان، طرز استدلال اور ترتیب معانی و مطالب بالکل جدید طرز پر ہوتی تھی، موضوع بحث سے گریز یا غلط مبحث کا ان کی تحریروں میں دور دور نشان نہیں ملتا، وہ معاصر ماخذ کے سہارے تفسیر و تعبیر کا قدم آگے بڑھاتے تھے، فرانسیسی ادیبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریریں، انداز بیان و مطالب میں صاف شفاف دریا کی روانی کی مانند ہوتی ہیں، اردو لٹریچر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بڑی جاندار زبان ایسے ستھرے اور پرتاثیر انداز میں لکھتے تھے، کہ اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے، تحریر کی یہ خوبی نفس مضمون پر کامل عبور کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱۰) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قدرت نے اخذ و استنباط کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی تھی، دوران مطالعہ جب کوئی ایسا واقعہ نظر سے گذرتا جو ان کے موضوعات تحقیق سے متعلق ہوتا تو ان کا مرتب ذہن فوراً اس کو مناسب جگہ منتقل کر دیتا تھا، اور یہ کیفیت اس طرح ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی کہ تقریر بھی کرتے تو مرتب، مربوط اور مدلل، اگر ضبط تحریر میں آجائے تو منظم مقالہ کا گمان ہو، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ترتیب ان کی کوشش کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے منظم مطالعہ اور گہرے فکر سے ایک مربوط شکل اختیار کر لیتی تھی، پھر یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ان کی بعض بہترین تصانیف عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی عمر خیام، ابتداء میں لیکچرس کی صورت میں پیش کیے گئے تھے،

(۱۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی علمی تحقیقات میں "دل" کو پاسبان عقل بنا کر رکھا تھا، نہایت مدلل گفتگو کرتے، حوالوں سے دلیل کو محکم بناتے، لیکن دل کی پاسبانی ہر جگہ رہتی، بہت دنوں کی بات ہے، راقم نے اس وقت شاید ایک دو مضمون لکھے ہوں گے، سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیے، ملاحظہ

فرماکر لکھا :

"آپ کی طرز تحقیق اور جمع معلومات سے خوشی ہوئی، دماغ سے پہلے دل کی ضرورت ہے، وہ مورخ جو دماغ رکھتے ہیں اور دل نہیں رکھتے، ان کے آثار قلم کی موجیں سراب ہیں، تاریخ تمام تر کچا مواد ہے، اس سے جیسا سامان دل چاہے تیار کر لیجیے۔"

ان جملوں میں تنبیہ بھی تھی اور نصیحت بھی، خود ان کا مسلک بھی اس میں جھلکتا تھا، اس وقت یہ حقیقت آپ سے چھپانا نہیں، چاہتا کہ اس وقت یہ بات قدامت پسندی اور مذہبیت کے غلو کا اثر محسوس ہوئی تھی لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا، اس نصیحت کی صداقت واضح ہوتی گئی، میرٹھ میں ایک بار انھوں نے پورا دن میری قلمی کتابوں کا ذخیرہ دیکھنے میں گذارا، اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں نوٹس لکھتے جاتے تھے، اور بتاتے جاتے تھے کہ ایک ہی مواد کس طرح متضاد مقاصد کے لیئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اور جب تک انسان کا دل تاریخ کے بکھرے ہوئے مواد میں ربط نہ پیدا کرلے اس میں جان نہیں پڑسکتی محض مواد کے سہارے نہ فکر انسانی کی تہ تک پہونچا جاسکتا ہے، نہ انسانی اعمال کا جائزہ ممکن ہے، اس وقت میرٹھ کا ذکر آیا تو ایک واقعہ اور بیان کردوں میں نے سید صاحبؒ کو ایک عربی مخطوطہ دکھایا، جس کی خصوصیات سے میں خود ناواقف تھا، اس کی سطریں مختلف روشنائی سے کئی کئی ٹکڑوں میں لکھی ہوئی تھیں، اور پھر ہر نیچے کی سطر اسی ترتیب سے تھی، تقریباً ایک گھنٹہ اس مخطوطہ کو دیکھتے رہے پھر مسکرا کر فرمایا: یہ علم کی جادوگری تو دیکھیے، ایک کتاب میں مختلف فنون جمع کر دیے ہیں، مسلسل پڑھیے تو ایک فن ہے، اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرا فن، آخری حصوں کو ملا کر پڑھیے تو تیسرا، پھر چند سطریں پڑھ کر سمجھائیں، اس وقت اندازہ ہوا کہ مختلف علوم پر ان کی نظر کتنی گہری اور مطالعہ کتنا وسیع تھا، تحقیق کے میدان میں ان کی ہمت افزائی اور ذرہ نوازی کے احساس کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں،

(۱۲) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو شدید احساس تھا کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ انگریز مورخوں کے ہاتھوں مسخ ہوگئی ہے، اس کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے، مدراس میں انڈین ہسٹری کانگریس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

"اب ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کیلئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہوسکے۔"

یہ بوڑھے مورخ کی آواز تھی، جو ۱۹۴۲ء میں بلند ہوئی تھی لیکن صدا بصحرا ثابت ہوئی، اور تاریخ کو مسخ کرنے کا کام پہلے سے تیز تر ہوگیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف موضوع کے اعتبار سے سیرت، تاریخ، ادب اور جغرافیہ میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، گو ان کی فکری وحدت کی طرف ہم نے شروع ہی میں اشارہ کردیا ہے، "سیرۃ النبیؐ" کا خواب مولانا شبلیؒ نے دیکھا تھا، دم واپسیں ان کے لب پر "سیرۃ، سیرۃ" تھا، انھوں نے اپنے شاگرد کو وصیت کی کہ اس کام کو سب سے پہلے مکمل کیا جائے، مولانا شبلیؒ نے سیرت کا کام تحقیق کی بہت اونچی محراب پر سجایا تھا، اور جلد اول کی طباعت سے پہلے اس سلسلہ کے جو مضامین "الہلال" میں شایع کیے تھے، ان میں اعلان کیا تھا:

"تیرہ سو برس کی وسیع مدت میں ایک کتاب بھی اس فن (سیرت) میں ایسی تصنیف نہیں کی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔ محدثین نے تنقید تحقیق کی ضرورت کو احادیث احکام کے ساتھ خاص کردیا ہے۔"

یہ بہت بڑا اعلان تھا، اور بہت بڑی ذمہ داری، اس کی روشنی میں سیرت نبویؐ کا سارا سرمایہ تحقیق وتنقید کی نئی کسوٹیوں پر پرکھنا ضروری ہوگیا تھا، مولانا شبلیؒ نے اس کام کے لیے اپنی جان نذر کی تھی، بھوپال سے مناسبت کی بنا پر یہ قطعہ پورا ہی سن لیجیے ؎

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے

رہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض رو رہا تھا، میں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

مولانا شبلیؒ نے حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب التوسل کی روشنی میں ایسی بہت سی احادیث کو نظر انداز کر دیا جو اصول اسناد پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ استاد کی بنائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہوئے اور تحقیقی پیمانوں کو انھوں نے اور زیادہ مضبوط بنا دیا، جلد اول کے طبع چہارم میں لکھتے ہیں:

"اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے، اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحات کو الٹنا، مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی۔" (ص ۲)

جس مقام پر مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کیا کہ علمی دیانت کا تقاضا تھا، فروتر ماخذ کی جگہ بالاتر کے حوالے دیے کہ جدید تحقیقی اصولوں کا مطالبہ تھا، جو کتابیں مصنف کی زندگی میں طبع نہ ہوئی تھیں (مثلاً ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ) ان کو پوری طرح استعمال کیا، مبادا ماخذ کی تشنگی کتاب کے علمی مرتبے کو متاثر کر دے، پھر جب اور جلدوں کی تکمیل کا وقت آیا تو گو مولانا شبلیؒ کا دیا ہوا چراغ ان کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ اپنی تحقیق سے بھی نئے عنوانات پیدا کرتے رہے، سیرت کی آخری تین جلدیں جن میں منصب نبوت اور تعلیمات اخلاقی پر گفتگو کی ہے، دینی فکر، تحقیقی نظر اور تنقیدی صلاحیتوں کا شاہکار ہیں، علم کی جس وحدت کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کا بہترین نمونہ یہ جلدیں ہیں، ان کی تکمیل میں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ سب نے اپنے خزانۂ معلومات ان کے حوالے کر دیے ہیں، اور اسلامی اخلاق کا پورا فلسفہ مرتب کرنے کے بعد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم اخلاق کی حیثیت سے اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سیرت رسولؐ دونوں ایک ہیں، سیرت کے یہ حصے بے شمار کتابوں کا ماخذ بنے ہیں، نبی کریمؐ کی ذات اقدس، اسلام کی تعلیمات اور اس کے اثرات کو اس طرح عصر حاضر کے مزاج اور ضروریات کے

مطابق کسی اور مصنف نے پیش نہیں کیا تھا، ان سے مستشرقین کی صدہا افترا پردازیوں کا سد باب ہوا ہے، اور ہزارہا غلط روایات کی جو خود مسلمانوں میں رائج تھیں، اصلاح ہوئی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مرتبہ سیرت نبویؐ سے متعلق بعض روایتوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ایران میں بعض لوگوں نے وعظ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا، اور چونکہ قابل اور اہل قلم بھی تھے، اس لیے اپنی مجالس کو کتب سیر و قصص کی صورت میں مدون بھی کر دیا، مثلاً ملا حسین واعظ الکاشفی اور ملا معین الدین ہروی علی الخصوص آخر الذکر شخص جو فی الحقیقۃ انشاء پردازی و حکایت طرازی و اقتباس روایات ضعیفہ و موضوعہ و تاویلات رکیکۂ قرآن و سنت، و عبور در رسوخ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملا معین ہروی کی کتابوں معارج النبوۃ، تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ نقرہ کار، قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔"

(الہلال ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء ص ۸۷)

سیرۃ النبیؐ کا یہ عظیم الشان کارنامہ تاریخ بھلا نہیں سکتی کہ اس کے ذریعہ اسلامی ذہن، اسرائیلیات کے گورکھ دھندوں سے نکل کر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آ گیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تاریخ کے آئینہ میں اس طرح جگمگا اٹھی کہ مذاہب عالم کو اس کی عظمت و شان کے آگے سر خم کرنے پڑ گئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت کو پوری طرح اور موثر طریقہ پر واضح کیا کہ ذات نبویؐ ہر انسان کے لیے خواہ وہ کسی زمان و مکان، مرتبہ و حیثیت سے تعلق رکھتا ہو، یکساں طور پر سرچشمۂ ہدایت ہے، شاید ہی کسی دوسری زبان میں سیرۃ النبیؐ کے پایہ کی کتاب لکھی گئی ہو، اس میں روایات کی صحت، بیان کی دلکشی، مباحث کا تنوع، تحقیق کی جستجو، اور صحیح اسلامی فکر کی کارفرمائی حیرت انگیز ہے، خطبات مدراس میں حقیقتاً ان جلدوں کا عطر کشید ہو کر آ گیا ہے، مذہبی عنوانات پر ایسا طرز تخاطب کہ معتقد اور مخالف سب کے دل سچائی کی آواز سن لیں، سید سلیمان ندویؒ کا اعجاز ہے،

آخری زمانہ میں ایک بار ان خطبات کے متعلق انھوں نے یہ مصرع پڑھ کر اس کی تالیف کا پورا پس منظر واضح کر دیا تھا کہ

من قاش فروش دلِ صد پارهٔ خویشم

سید صاحبؒ نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دیا کہ: اقتدی جس پر مارگولیتھ نے اپنی تحقیق کی ساری عمارتیں تعمیر کی ہیں، ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، "سیرۃ النبیؐ" نے سید سلیمان ندویؒ کو عالم اسلام کی فکری تاریخ میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

سیرت عائشہؓ کو حقیقت میں سیرۃ النبیؐ کا تتمہ سمجھنا چاہیے، یہ کام طالب علمی میں شروع کیا تھا، پونہ کے قیام کے زمانہ میں مولانا شبلیؒ اس کی تکمیل کا تقاضا کرتے رہے، مولانا اسلم جے راج پوری نے اسی زمانہ میں سیرت عائشہؓ لکھی تو مولانا شبلیؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ہدایت کی:

"اس کو دیکھ لو، اس سے بہت الگ رہے، یا بہت آگے نکل جائے۔"

ان دو جملوں میں استاد کی پوری ذہنی کیفیت اور شاگرد سے توقعات کی پوری تصویر ابھر آئی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جس تحقیقی انداز میں یہ سیرت لکھی تھی، اس کا اعتراف اقبالؔ نے بھی کیا، زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر جو رائے سیرت عائشہ میں ظاہر کی گئی تھی، اس سے پیر تھانویؒ کے ارشاد پر رجوع کر لیا گیا، لیکن اور تفصیلات میں وہ کتاب اپنے موضوع پر ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہے۔

ان کا مختصر رسالہ "رسول وحدت" اپنے موضوع پر بے مثال ہے، اس میں وحدت الٰہی، وحدت کتاب، وحدت انسانیت اور آخر میں وحدت دین و دنیا پر جس طرح گفتگو کی گئی ہے اس سے اسلام کی عالمگیر حیثیت واضح ہو گئی ہے، اس رسالہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے،

"سیرت امام مالکؒ" کی تدوین میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ ایسے شخص کے حالات زندگی سے باخبر کرنا تھا جس کی تالیف میں حجازی فکر جلوہ گر تھی، موطا تاریخی، فقہی، محدثانہ تینوں حیثیتوں سے فکر اسلامی میں اعلیٰ مقام

رکھتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کی تو یہ رائے تھی کہ

"صحیح بخاری و صحیح مسلم ہر چند در بسط و کثرت احادیث وہ چند موطا باشند، لیکن طرق روایت احادیث و تمیز رجال در اعتبار و استنباط از موطا آموختہ اند" (المصفیٰ)

مولانا سید سلیمان ندویؒ شاہ ولی اللہؒ ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، اور موطا کو دینی فکر کی اساس بنا کر مسائل پر رائے دیتے تھے، حقیقۃً انھوں نے امام مالکؒ پر الندوہ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا، بعد کو اس میں اضافہ کیا، اور کتاب کی صورت میں شایع کر دیا۔

"عرب و ہند کے تعلقات" وہ گراں بہا علمی یادگار ہے جو سید صاحبؒ کے نام کو بحیثیت مورخ ہمیشہ زندہ رکھے گی، انھوں نے چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے چن کر مٹھائی تیار کی ہے، اس کی تیاری میں ان کی محنت اور اس کی ترتیب میں ان کی مورخانہ بصیرت حیرت انگیز ہے، عرب و ہند کے تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات پر انھوں نے ۱۹۲۹ء میں جو لکھا تھا اس کے بہت سے بیانات کی تائید حال میں "Geniza Records" کی دریافت سے ہوئی ہے، اس کتاب میں بعض ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جن پر مستقل کام کیا جا سکتا ہے، مثلاً عربی ماخذ سے ایلیٹ کے ادھورے کام کی تکمیل تاکہ "یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو چند صدیوں کا غار رہ جاتا ہے وہ پٹ جائے" (ص ۴۳) برامکہ کے متعلق یہ تحقیق کہ وہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے (ص ۱۱۴) یا F. Rosen کے اس خیال کی تردید کہ لفظ "ہندسہ" ہند سے مشتق ہے (ص ۱۴۴) یا عرب، ترک اور مغل فاتحوں کا فرق (ص ۱۸۷) جس سے فتوحات کی نوعیت، فاتحین کے مقاصد جنگ پر روشنی پڑتی ہے، اور تاریخ ہند کو سمجھنے اور قرون وسطیٰ میں ہندوؤں سے تعلقات کی حقیقی نوعیت واضح ہو جاتی ہے عرب فاتحوں کا یہ فیصلہ کہ ہندو مشابہ اہل کتاب تھے، (ص ۱۹۴) بڑا اہم تھا، اس کے امکانات پر تفصیلی گفتگو آج تک نہ ہو سکی، پھر ایک پورا باب "ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے" انتہائی بصیرت افروز ہے، اس باب میں ان کا دائرۂ تحقیق زیادہ تر سراندیپ، ساحلی علاقوں اور گجرات تک محدود ہے، لیکن محض یہ

رائے کہ مسلمانوں کی آبادی فتوحات سے قبل اس ملک میں موجود تھی، فی نفسہ اہم ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس نظریہ سے متاثر ہوکر راقم الحروف نے شمالی ہندوستان میں نومسلم آبادیات کا پتہ لگانے کی کوشش کی، اور بالآخر تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہوگیا کہ اجمیر، ناگور، قنوج، بدایوں وغیرہ میں فتوحات سے قبل مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں، ان مباحث کے علاوہ جن پر مستقل تحقیق کی ضرورت ہے، بعض ایسے اشارے بھی اس کتاب میں ہیں جن کی روشنی میں بعض تاریخی واقعات اور بھی اہمیت اختیار کرلیتے ہیں، مثلاً سندھ میں قبائل کی نوعیت اور وہاں کے حالات پر ان کا اثر، سندھ میں عرب حکومت کا قیام، قرامطہ کے اثرات اسماعیلی فرقوں کا نشوونما وغیرہ وغیرہ، اگر ۱۹۲۹ء کے بعد کی بعض اہم انگریزی تاریخی تصانیف کا جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سید صاحبؒ کے خاموش اشاروں نے کس کس کو راہ دکھائی ہے، ۱۹۱۸ء میں انھوں نے "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی" پر مفصل مضمون لکھ کر تحقیق کا نیا عنوان فراہم کردیا تھا، جس سے متاثر ہوکر بعض کتابیں انگریزی میں ضرور لکھی گئیں، لیکن کام پوری طرح آگے نہ بڑھ سکا۔

تاریخ جغرافیہ کے پس منظر کے بغیر بے روح رہتی ہے، یورپ کی جدید تحقیقات نے ایک نئے علم Geopolitics (سیاست ارضی) کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی روشنی میں یورپ، امریکہ اور جاپان میں مورخین کی جماعتیں بڑی مفید تحقیقات میں مصروف ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے زمانہ میں یہ علم وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ان کا ذہن جغرافیہ کی اہمیت کو ان ہی خطوط پر محسوس کر رہا تھا، جو بالآخر اس فن کو ایک واضح اور متعین شکل دینے میں موثر ثابت ہوئے، تاریخ ارض القرآن حقیقۃً سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ تھا جو حجم بڑھ جانے کے باعث علیحدہ شائع کردیا گیا، تاریخ ارض القرآن اور عربوں کی جہاز رانی میں تاریخ جغرافیہ، اور ارضی سیاست کے باہمی تعلق پر بعض دلچسپ اشارے ہیں، عیسائی مصنفین نے Bibilical Lands پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، لیکن ارض القرآن پر مسلمانوں نے کوئی تحقیقی کام اس سے پہلے غالباً نہیں کیا تھا، لیکن Biblical

Lands پر تحقیق کا کام اب تک جاری ہے، تاریخ ارض القرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مزید تحقیق نہیں کی گئی، گو مغرب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، ارض القرآن نے کلام پاک کے بیانات کی تاریخی اور جغرافیائی مطابقت اس طرح کردی ہے کہ بہت سے نئے پہلو سامنے آگئے ہیں، تحقیقی جستجو کا یہ کمال ہے کہ جب عربوں کی جہاز رانی پر گفتگو کی تو سب سے پہلے عربی بحری لغات کی ایک فہرست تیار کردی جس میں فارسی، ہندی، چینی، یونانی اور لاطینی الفاظ کا فرق اور ماحول پیش کردیا، پھر قدیم عرب شعراء کے کلام سے جہاز رانی کی تفصیلات حاصل کرنے کے بعد قرآن پاک میں جہاں جہاں کشتی، سمندر، بادبان وغیرہ کا ذکر ہے اس طرح جمع کرکے پیش کیا کہ بحری دنیا اور اس کے مسائل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی، سورۂ بنی اسرائیل (۷) اور سورۂ لقمان (۴) میں جس طرح بحری خطرات کا ذکر ہے، اس سے دلچسپ نتائج مرتب کیے، پھر بتایا کہ نہر سوئز کا تخیل سب سے پہلے عمروؓ بن العاص کے ذہن میں آیا تھا، پھر بندرگاہوں کے بیان سے پوری تحقیق میں ایک جان ڈال دی، ابن خلدون نے سمندروں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے تفصیلی اقتباسات سے مسلمانوں کے جغرافیائی ذہن کی ایک تصویر بنانے کی کوشش کی، شاید وہ وقت آئے جب ارضی سیاست کا کوئی طالب علم اس کتاب کو ایک نئے پیکر میں ڈھال کر تصورات کی ایک نئی دنیا پیش کردے۔

تصوف پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، بعض مضامین میں اشارے ضرور ملتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تصوف پر لکھنے کا جب وقت آیا تو تصنیف وتالیف سے ان کی طبیعت بھر چکی تھی، علاوہ ازیں جو کیفیت ان پر طاری ہوگئی تھی اس کا زبان قلم پر لانا بھی آسان نہ تھا، اس لیے خاموشی کو ہمراز بنا کر انھوں نے تصوف پر اظہار خیال سے گریز کیا، میں نے ایک بار تصوف میں اپنی دلچسپی اور اس پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا: "کیا آم کو چکھے بغیر اس کا ذائقہ بیان کیا جاسکتا ہے؟"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصوف پر ان کے خیالات مختلف منزلوں سے گذرے تھے، ۱۹۱۷ء میں

تصوف سے متعلق ان کے خیالات ناقدانہ تھے، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اقبالؔ کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی پر انھوں نے اقبالؔ کی ہمنوائی کی، ۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں اقبالؔ لکھتے ہیں:

"میں مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان ہی نتائج پر پہونچا ہوں جو آپ کے والا نامہ میں درج ہیں، جو کام آپ کر رہے ہیں وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔"

(اقبال نامہ ج ۱، ص ۷۸۔۷۷)

لیکن ایک وقت آیا جب دونوں اپنے اس موقف سے ہٹے، اور تصوف کے دامن میں پناہ لی، اقبالؔ نے حقیقی تصوف میں تعمیر خودی کا راز پایا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کو دین کی روح اور ایمان کا کمال قرار دیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادبی ذوق اور شعر و سخن میں دلچسپی کے متعلق کچھ کہنا لا حاصل ہے، انھوں نے "ہندوستان میں ہندوستانی" اور الفاظ کی تہذیب پر جو پرمغز مضامین لکھے ہیں وہ تحقیق کی نئی راہ دکھاتے ہیں، "نقوشِ سلیمانی" میں اردو زبان اور ادب سے متعلق ان کے خطبات و مقالات معلومات کا گنجینہ ہیں۔

ایرانی شاعری بہت سے ادبی رجحانات اور مذہبی افکار کا منبع و مخزج تھی اور اس کا مطالعہ ہماری تہذیب کا جزو تھا، خود مولانا شبلیؒ نے "شعر العجم" لکھ کر فارسی شاعری میں نیا ذوق پیدا کر دیا تھا، بقول مولانا ابو الکلام آزاد وہ فارسی کے آخری شاعر تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مزاج محققانہ تھا، شاعرانہ نہ تھا، مولانا شبلیؒ کی طرح انھوں نے فارسی میں سوز و گداز سے تڑپتے ہوئے اشعار نہیں کہے، لیکن ناقدانہ بصیرت اور عرفان شعر کا ان کو خاص حصہ ملا تھا، خیام پر ان کا کام ادبی ذوق اور شاعرانہ بصیرت اور محققانہ کمال کا آئینہ دار ہے، خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہار کے لیے پیش کی ہے کہ اہل مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں"، انھوں نے خیامؔ کے فلسفہ کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے، اور مروجہ نظریات میں جو مستشرقین کی دین تھے، ایک انقلاب برپا کر دیا، اقبالؔ کا یہ کہنا کہ اس موضوع پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہیں کر سکتا، سب سے بڑا خراج تحسین ہے جو ان کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے نظر ان کی تصانیف تک محدود نہیں رہنی چاہیے، معارفؔ میں ان کے مقالات، شذرات، اخبار علمیہ ان کے انداز فکر اور وسیع معلومات کے آئینہ دار ہیں، خود معارفؔ نے جو مقام پیدا کیا، وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مساعی کا رہین منت ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک بار کہا تھا کہ "بحمد اللہ

مولانا شبلیؒ کی تمنائیں رائگاں نہ گئیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیر، تاریخ، ادب، ہر میدان میں اپنی تحقیق اور معلومات کے نہ مٹنے والے نقش چھوڑے ہیں، اس صدی کے نصف اول میں ان کی شخصیت علوم اسلامی کی جوئے شیر بن کر کوہ و صحرا کو سیراب کرتی نظر آتی ہے، اقبال نے سچ کہا ہے

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

حیات سلیمان

مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

جانشین شبلی اور معمار دارالمصنفین علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و حالات اور ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، ملی، سیاسی خدمات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اسلوب اور طرز انشاء اور تحقیق و تلاش و جستجو کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثمنی، دلکش، دلچسپ، دل پذیر اور قابل مطالعہ، جس میں ان کے پورے دور کی تمام ملی و قومی و سیاسی و ادبی و لسانی تحریکوں کی تفصیل کے ساتھ دارالمصنفین کی تاسیس، اس کے عہد بہ عہد ترقی کی روداد، قیام بھوپال، مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان، سفر پاکستان اور چند روزہ علالت کے بعد وفات اور تدفین وغیرہ کے حالات بھی آگئے ہیں۔

قیمت :- ۴۳ روپیے

"منیجر"

وراقت کتاب منزل بمنزل

از، مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، کانو، نائیجیریا،

(۳)

عہد عباسی کے کتب فروشوں کی خصوصیات

(۱) اس دور میں کتب فروش، و وراق عام طور پر عالم ہوتے تھے، وہ کتابیں صحیح نقل کر کے مناسب داموں پر فروخت کرتے، قدر دانوں اور ضرورت مندوں کی علمی ضروریات کی تکمیل کرتے، پسندیدہ کتابیں مہیا کرتے تھے، طلب و رسد کے فروغ اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت کی غرض سے دلال کتب، اہل علم، اہل خیر اور شائقین کتب کے مکانوں پر کتابیں پہنچاتے تھے، چنانچہ وراقوں کی جماعت ابو نصر سہل بن مرزبان تریلی نیشاپور کے محل سرا میں کتابیں دکھانے آتی تھی[۱]، یاقوت رومی، جمال الدین قفطی کو کتابیں پہنچاتے تھے[۲]، اہل علم جہاں کہیں جاتے کتابیں نقل کرنے کے لیے وراقوں کی جماعت ساتھ لیجاتے تھے۔[۳]

۲۔ عہد عباسی میں بعض کتب فروش اور وراق کتابوں کی تجارت ہی نہیں کرتے بلکہ گوناگوں موضوعات پر تحقیقی و علمی کتابیں بھی تصنیف و تالیف کرتے تھے جیسے یاقوت رومی وغیرہ

۳۔ دور عباسی میں بعض کتب فروشوں نے تجارت کتب کے ساتھ علم کتاب داری کو بھی بہت ترقی دی، چنانچہ ابن الندیم وراق نے چوتھی صدی ہجری میں عربی زبان کی قومی کتابیات (یعنی عام) (National. Bibliography) "الفہرست" مرتب کی جس میں

---

[۱] یتیمۃ الدہر للثعالبی ج ۲ ص ۲۹۲ [۲] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۸۴ [۳] الانساب للسمعانی ورق ۳۵۳۔

عباسی قلمرو کے علمی تحقیقی سرمایہ خاص طور پر دارالخلافہ بغداد اور موصل وغیرہ کا جائزہ پیش کیا اور ان کتابوں کا جو اس کی نظر سے گذری تھیں کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی تعارف کرایا، مصنفین کے حالات بھی قلمبند کیے، جس سے چوتھی صدی ہجری تک گوناگوں علوم وفنون اور ہر علم کے مختلف شعبوں میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کے متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ گوناگوں اصناف علوم پر کتنی تالیفات ہو چکی تھیں۔

۴۔ عہد عباسی کے بعض وراقوں نے وراقت کے پیشہ کے ساتھ علوم وفنون کا نہایت مبسوط دائرۃ المعارف بھی ترتیب دیا تھا، چنانچہ ابوالوفا علی بن عقیل بغدادی المتوفی ۵۱۳ھ نے اسلامی تاریخ میں کتاب الفنون کے نام سے نہایت جامع دائرۃ المعارف تالیف کیا تھا، جس کے متعلق ارباب تذکرہ کا بیان ہے، کہ یہ دو سو اور آٹھ سو مجلدات کے مابین تھا۔[1]

۵۔ عہد عباسی کے وراق ابن الندیم وغیرہ کتابوں کے اندرونی اسرار وخزائن سے بھی اچھی طرح واقف ہوتے تھے، اور اپنی کتابیات کے ذریعہ اہل علم کو بھی باخبر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔[2]

وراق وکتب فروش عالم کے علمی وادبی ذوق سے اس کی اولاد اور خاندان بھی متاثر ہوتا تھا، چنانچہ اندلس کے اندر چوتھی صدی ہجری میں تاجر کتب ایاد بن عبداللہ عوفی وادی اشی کی دو بیٹیاں حمدہ اور زینب بلند پایہ شاعرہ تھیں، حمدہ خنساء مغرب کے لقب سے ممتاز تھیں اور دیگر اصناف علوم میں ماہر تھیں۔[3]

۶۔ گشتی اشاعت، عہد عباسی کے وراقوں نے گشتی اشاعت کتب (movable Publishing)

---

[1] کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ لابن رجب القاہرہ ۱۳۷۲ھ ج ۱ ص ۵۷ علامہ عبدالعزیز المیمنی جو راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔ [2] تقریظ بر مقالہ عہد رسالت سے دور اموی تک اسلامی کتب خانوں کا ارتقاء [3] معجم الادباء ج ۳ ص ۲۴۴ فوات الوحیات للکتبی ج ۱ ص ۲۸۹، نفح الطیب للمقری ص ۳۴۴-۳۵۰ اعلام النساء للکحالہ ج ۱ ص ۲۹۲-۲۹۳، ج ۲ ص ۹۵، شبیبی ص ۳

Ameer ali A short histry of the Saraceens 1961. P. 569-

کا آغاز کیا، چنانچہ وراقوں کی جماعت اہل علم کے ہمراہ جاتی اور کتابیں نقل کر کے شائع کرتی تھی۔[1]

ازمنۂ قدیمہ ومتوسطہ میں یہ تو ہوتا تھا کہ ایک منزل پر کوئی معبد، محل یا ادارہ ہوتا، اس میں کاتب از خود اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا لیکن ان ادوار قدیمہ ومتوسطہ میں کہیں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کاتب وخوشنویس (Scribe) جماعتوں کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنا کام کرتے ہوئے جاتے ہوں، اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے، اپنا ہنر جاری رکھتے ہوں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک ابلاغ علم وکتب کی ابتداء اسلام سے ہوئی، اور مسلمانوں نے علم کی تلاش میں کوچہ، شہر، ملک ہی نہیں، براعظموں کو بھی چھان مارا تھا۔ ان کا یہ سیر وسفر خالی نہیں ہوتا تھا، وہ اگر خود خطاط نہیں ہوتے تھے تو اپنے ساتھ وراق وخطاط رکھتے تھے، وہ جگہ جگہ کتابیں نقل کرتے رہتے، اس طرح ان کے فن کی بھی نمائش ہوتی رہتی تھی۔[2]

عہد عباسی میں تجارت کتب فن کی حیثیت سے اتنی ترقی کر چکی تھی کہ بقول بعض ابن الندیم کو بک سیلر کیٹیلاگ (Book-Seller catalogue) تیار کرنا پڑا تھا، اور اس کیٹیلاگ کے اسباب وعلل میں صرف تجارت ونفع اندوزی کارفرما نہ تھی، بلکہ علم وکتاب داری کی تاریخ میں بک سیلر کیٹیلاگ کی ابتداء اسی "الفہرست" سے قرار پاتی ہے۔ ابن الندیم نے اس میں بعض کتب اور مصنفین کے متعلق بیاض اس لیے چھوڑی تھی کہ وہ اس کے تجربہ ومشاہدہ میں نہیں آئے تھے، ان مقامات پر نہ وہ خود جا سکا تھا نہ وہ ان مصنفین سے مل سکا تھا، نہ ان کتابوں کو دیکھ سکا تھا نہ وہ ان کے متعلق اپنے دوستوں سے معلومات حاصل کر سکا تھا، لہٰذا دیانتدارانہ طور پر اس نے ان مقامات کو چھوڑ دیا تھا۔[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات کی ترتیب میں دیانتداری کے

---

[1] الانساب للسمعانی، ورق ۳۵۵، ۵۶۲ ب) [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۲ ص ۵۷۹ [3] ایضاً
[4] الفہرست لابن الندیم، ۲۴۹، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۸، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۸۱، ۳۹۰، ۳۹۳، ۳۹۵، ۴۱۳، ۴۱۴۔

پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا، چنانچہ ہمارے مذکورۂ بالا (اخذ کیے ہوئے) نتائج کی تصدیق وان کریم بھی کرتا ہے وہ ابن الندیم کے متعلق کہتا ہے،

"اسلام سے پہلے کی تاریخ میں یہ باتیں ہمیں کسی کتب فروش کے بارے میں نہیں ملتی ہیں۔" [1]

عہد عباسی کے کتب فروشوں اور وراقوں کی یہ وہ خصوصیات و کارنامے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی کے تاجروں میں ضابطۂ اخلاق وغیرہ بھی پایا جاتا تھا، جس کا سرسری سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ضابطۂ اخلاق (Code of Ethics) گو آج مرتب شکل میں ہمارے پاس موجود نہیں لیکن وہ کوڈ (Code) ہی تھا جس کی وجہ سے جعل سازیاں منظرِ عام پر آتی تھیں اور ایک تاجر سے دوسرے تاجر کو یہ خبریں پہنچتی تھیں، چنانچہ وہ اس قسم کے کام کے لیے خاص الفاظ جیسے وضع، تزید، اختلاق، انتحال اور ایسے افراد کے لیے "واضع" مختلق، منتحل و متزید کے اصطلاحی الفاظ بول کر ایک دوسرے کو صورت حال سے باخبر کرتے تھے۔ محدثین اور وراقوں میں ان کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے، اس طرح اہل علم اور وراقوں کو جلد ہی ان جعل سازوں اور ان کی جعل سازیوں کا علم ہو جاتا تھا، حالانکہ اس دور میں آج کے سے ذرائع ابلاغ یکسر مفقود تھے۔ [2]

۲۔ تحقیق اور جائزہ (Need of Research and Survey)

فن کتب فروشی میں تحقیق وجائزہ کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی، وہ اس دور میں کتب خانوں کا جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کرتے تھے جن کا مظاہرہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو وہ کتب خانوں کے ذخائر کی کمیت وکیفیت کی نشان دہی کے لیے استعمال کرتے تھے، یہ نشان دہی جائزہ کے

[1] مسلمانوں کی صنعت وحرفت، وزراعت، ص ۶۰-۶۱، [2] لابن الندیم، ص ۱۲۹ و ۳۵۵ (فلوگل)

بیرنا ممکن تھی، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے، کہ جائزہ کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے جس کی تفصیل باب اول میں گزر چکی ہے،

یہاں یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے کہ یہ جائزہ صرف اہل علم اور شائقین کتب ہی نہیں لیتے تھے، بلکہ وراق وکتب فروش بھی لیتے تھے، چنانچہ اہل علم اور شائقین کتب کے مرنے کے بعد ان کے ذخائر کتب کی تعداد کے بارے میں ان کے پاس معلومات ہوتی تھیں، اس لیے انہیں سودا کرنے میں آسانی ہوتی تھی [1]۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے، کہ عہد عباسی کے وراقوں میں اس امر کا شعور موجود تھا کہ وہ کاروباری اصول کے تحت فن کتب فروشی ہی پر نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ کتابیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی ان کی نظر اتنی گہری ہوتی تھی کہ وہ جعل سازوں سے جلد واقف ہوجاتے تھے، اور ان کے استحصال کا تدارک کرنے کے لیے اہل علم کو اس صورت حال سے آگاہ کرتے تھے، جعل سازی اور جعل سازوں کے لیے ان کے اصطلاحی الفاظ اس امر کا بین ثبوت ہیں۔

کتابیات، مختصرات و دیگر حوالہ جاتی مواد

عہد عباسی میں ذخائر کی وسعت کے پیش نظر ان کا احاطہ کرنے کے لیے کتابیات کی داغ بیل پڑ چکی تھی، مصنف وار کتابیات یعنی Author wise Bibliography کا رواج عام ہوگیا تھا۔ یونین کیٹلاگ بھی تیار کیا جانے لگا تھا جس کا ایک ابتدائی نمونہ ابن الندیم کی الفہرست ہے، ہر فن کی مصطلحات فن پر علیحدہ مختصر نوٹ بک لکھے جانے لگے تھے، جیسے ابن سینا کا رسالہ الحدود جو فن طب کی مصطلحات میں ہے، ابوالبرکات نسفی کی طلبۃ الطلبہ اور خوارزمی کی مفاتیح العلوم بھی اسی نوع کی کتابیں ہیں، جو طبع ہو چکی ہیں نیز ہر قسم کی معلومات کے لیے دائرۃ المعارف بھی مرتب کیے جاتے تھے۔

[1] انباء الرواۃ۔ للقفطی ج ۲ ص ۶۳

۳۔ اجتماعی تشہیر (Cooperetine Advertisement) عہد عباسی میں املا و روایت کے ذریعہ اجتماعی تشہیر کی جاتی تھی، اس کا مرکز مسجدیں، املا کی مجالس و درسگاہیں تھیں[1] سوق الوراقین کے وراق، گماشتے اور دلال کتب متن کے بارے میں تبصرے کرتے تھے، ان سے کتابوں کی تشہیر ہوتی تھی، اور ان مراکز میں اہتمام کے گماشتوں، وراقوں اور دلالوں کی آمد و رفت اجتماعی تشہیر کا باعث تھی، مجلس اور دربار میں وراق خبریں اور کتابیں پہنچاتے تھے۔[2] اس طرح وراقوں کی معرفت کتابوں کی انفرادی و اجتماعی تشہیر کا سلسلہ جاری تھا۔

۴۔ مختلف مسلک و نظریات رکھنے والی جماعتیں جیسے معتزلہ، ناصبیہ، حشویہ وغیرہ حکومت کے تعاون سے فن تجارت کتب کو بڑھانے کے لیے تعاون کرتی تھیں، چنانچہ معتزلہ کے ہمنوا فرمانروا اس مسلک کو فروغ دیتے، ان کی سرپرستی کرتے، ان کے مسلک کی کتابیں خرید کر جمع کرتے تھے[3]۔ اور ہم مذاق بادشاہوں، وزیروں کی وجہ سے انھیں ایک گونہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی[4] حکومت کتابیں خرید کر شاہی خزانۃ الکتب میں ذخیرہ کرتی، پھر عوامی کتب خانوں، نامور عالموں کو کتابیں اور مصحف پہنچاتی تھی[5]، حکومت خود کتابیں اور شرحیں لکھواتی، ان پر وظائف دیتی تھی[6] ان کی مرویات اور کتب کو وقف عام کراتی تھی[7]، چنانچہ فراء کو بیت الحکمۃ میں کتابیں املا کرانے کے لئے رکھا گیا تھا۔[8]

---

۱ تاریخ بغداد، ج ۴ ص ۵۰ ۔ ۲ معجم الادباء ج ۵ ص ۴۰۴، اعلام النبلاء للطباخ ج ۴ ص ۲۷
۳ رسائل الخوارزمی، ص ۲۱۶، الخطط المقریزیہ ج ۲ ص ۵۰۳، ۴ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۷، کتاب بغداد لابن طیفور ص ۱۸۱، النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۲۱۳ ۵ مرأۃ الزمان لسبط ابن الجوزی، ج ۸ ق ۲ ص ۱۳۶، ۴۳۹
الوافی بالوفیات ج ۲ ص ۹۶ ۶ الفہرست لابن الندیم ص ۹۰ ۷ معجم الادباء ج ۱ ص ۵۸ انباہ الرواۃ للقفطی ج ۳ ص ۱۹۳ ۸ جذوۃ المقتبس للحمیدی ص ۱۱ و ۱۲ البیان المغرب لابن عذاری ج ۱ ص ۵۲ الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۲۲۵ ۹ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۵۰۔

زجاجی کو جامع المنطق کی شرح لکھنے پر دو مددوں سے وظیفہ جاری کیا گیا تھا[1] موطا کی تالیف پر منصور نے سرکاری تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی[2]، لیکن امام موصوف نے اپنے مسلک کا سب کو پابند کرنے سے گریز کیا، اور سرکاری پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا[3] بقی بن مخلد المتوفی ۲۷۶ھ کو ان کے مشرق (ایشیا) سے لائے ہوئے علمی ذخیرے کو وقف عام کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔[4]

عہد عباسی کے معیاری ناشرین

عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں حسب ذیل قسم کے ناشرین کو معیاری و مستند ناشرین کی حیثیت حاصل تھی، ان کی لکھی ہوئی اور شائع کی ہوئی کتابوں کو صحت و ضبط میں استناد کا درجہ حاصل تھا، ان کی لکھی ہوئی کتابوں پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے[5]،

۱۔ مصنفین و شارحین، اپنی کتابوں کے مستند ناشر تھے، جو کتابیں وہ املا کراتے تھے، یا ان کی تصنیفات اور شرحیں جو ان کی زیر نگرانی نقل کی جاتی تھیں اور ان پر ان کے دستخط ثبت ہوتے تھے، وہ جامع معیاری و مستند نسخے سمجھے جاتے تھے[6]

۲۔ صاحب طرز خوشنویس جیسے ابن مقلہ ابن البواب وغیرہ

۳۔ نامور خوشنویس اور کاتب[7]

۴۔ درست نویس[8]

۵۔ علماء اور مصنفین کے وراق[9]

---

۱ الفہرست لابن الندیم، ص ۹۰ ۲ معجم العلماء ج ۱ ص ۸۰، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۱۳۳ ۳ المدارک للقاضی عیاض ج ۱ ص ۱۹۱-۱۹۲ ۴ ایضاً جامع بیان العلم لابن عبد البر ج ۱ ص ۱۳۲۔ تزیین الممالک للسیوطی ص ۴۶
۵ جذوۃ المقتبس ص ۱۱-۱۲، البیان المغرب لابن عذاری ج ۱ ص ۵۲، الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۲۲۵ ۶ انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲ ص ۳۳۳۔ ۷ معجم الادباء ج ۱ ص ۴۲ ۸ نزہۃ الالباء ص ۲۰۰، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲ ص ۳۱۹، معجم الادباء ج ۵ ص ۴۴۲
۹ معجم الادباء ج ۲ ص ۱۳۷، ۱۰ الوافی بالوفیات ج ۲ ص ۳۴۴۔ معجم الادباء ج ۶ ص ۷۵-۷۶۔

۶۔ اچھے ضابط (مشکل الفاظ پر صحت کے ساتھ اعراب لگانے والے) اور مصحح

۷۔ روایان کتب جیسے امام بخاری کے شاگرد فوبری وغیرہ کے نسخے[1] یا ابوعبیدہ کی کتابوں کے اصمی کے ایڈیشن، ابوعبیدہ معمر کے تلمیذ ابوغسان کے ایڈیشن۔

۸۔ خاص خاص اصناف علم کے ناشر، جیسے ابوسعید حسن بن حسین سکری المتوفی ۲۷۵ھ دواوین عرب کا ناشر تھا، یہ جس کا دیوان لکھتا اس کے کلام کا کوئی حصہ چھوڑتا نہ تھا۔[2]

ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ جاحظ کی کتابوں کا ناشر تھا۔[3]

۹۔ وہ ارباب تدریس جن کے پاس اہل علم سفر کرکے آتے تھے وہ اپنی مرویات اور اپنے اساتذہ کی تالیفات کے مستند ناشر تھے، ان کے تلامذہ میں بعض ان کتابوں کے ناشر تھے، وہ کتابیں لکھتے اور نقل کرکے بیچتے بھی تھے۔

عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں، فروغ تجارت کتب کے عوامل حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں میں کتاب و سنت سے جذباتی لگاؤ نے کتابی صورت میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا بے پایاں جذبہ پیدا کیا۔

۲۔ روز افزوں تعلیمی حلقوں کی وسعت اور نصابی و غیر نصابی کتب کی طلب،

۳۔ علمی و تحقیقی ضروریات کی تکمیل کے لیے کتابوں کی ضرورت۔

۴۔ وقف کے ترقی پذیر سلسلے کی فراوانی۔

۵۔ ہدایا

۶۔ جمع کتب کا شوق۔

۷۔ بڑے پیمانے پر کتب خانوں کے قیام کا اہتمام۔

---

[1] فتح الباری، ج ۲ ص ۸۰ [2] معجم الادباء ج ۲ ص ۶۲ [3] ایضاً ج ۶ ص ۷۵۔

۸۔ مکانی زیب و زینت کے لیے کتابوں کی احتیاج

۹۔ وراقت و کتابت کا سودمند ذریعۂ معاش کی حیثیت اختیار کر جانا۔

۱۰۔ وراقت و کتابت کا معاشرہ میں منفعت بخش کاروبار کے علاوہ تحقیق و تسکین ذوق کا بھی اہم ذریعہ بن جانا۔

ان حقائق کی روشنی میں وان کریمر کا یہ کہنا۔

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص تجارتی نقطۂ نظر سے کتابوں کی تجارت کتنی تھی، اور اس نے کتنی ترقی کی تھی۔"[1]

ہمارے اخذ کئے ہوئے نتائج کی تصدیق کرتا ہے۔

اشاعت کتب کی صورتیں اوائل عہد عباسی میں کتابوں کی نشر و اشاعت کی منجملہ اور صورتوں کے ایک صورت یہ بھی تھی کہ مولف اپنی تالیفات خود خواہشمندوں تک پہنچاتا تھا، چنانچہ ابوعمرو اسحاق بن مرار شیبانی المتوفی ۲۱۰ھ نے اسّی سے اوپر شعرائے عرب کا کلام مدون کیا تھا، موصوف کا معمول تھا کہ جس قبیلے کے شاعر کا کلام قلمبند کرتے اسی کے قبیلہ میں خود پہنچاتے تھے، اس سے اس کے دیوان کی خوب اشاعت ہوتی تھی۔[2] اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اوائل عہد عباسی میں اسّی قبیلوں میں ہر قبیلے میں کتب خانے کے قیام کے لیے موصوف کی بے نظیر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

عہد عباسی میں کتابوں کی توسیع و اشاعت میں اجازت روایت کتب نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، "اجازہ" قابلیت کی سند و اجازت جو استاد کی علمی املاک کے تصرف کو ثابت کرتی تھی کبھی تحریری ہوتی کبھی "زبانی" اور کبھی بالواسطہ پہنچتی تھی، یہ کبھی اول کتاب میں،

---

[1] مسلمانوں کی صنعت حرفت، زراعت تجارت از وان کریمر ترجمہ جمیل الرحمٰن، ص ۸۲۔

[2] تاریخ بغداد، ج ۶ ص ۳۳۰۔

کبھی آخر کتاب میں اور کبھی جداگانہ ورق پر لکھی جاتی، اس پر استاد کے دستخط ثبت ہوتے تھے محدثین نے اجازہ کی جو گوناگوں صورتیں روا رکھی ہیں، ان سے علوم و کتب کی مستند نشر و اشاعت ہوئی، محدثین نے اجازہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ کتاب کو سنکر یا پڑھ کر یا پڑھوا کر طالب کو زبانی روایت کتاب کی اجازت دے یہ اجازت بالمشافہ ہے۔[۵۱]

۲۔ شیخ اگر لکھ کر اجازت دے تو اسے اجازت بالمکاتبہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ شیخ اگر اپنا اصلی نسخہ یا اس کی نقل طالب کو دے یا طالب کے پاس جو اصلی نسخہ شیخ کا ہو اسے لے کر طالب دے تو اسے مناولہ کہا جاتا ہے، خواہ مالک بنائے خواہ عاریۃً دے تاکہ طالب اس کو نقل کر کے اس کا مقابلہ کر لے۔[۵۲]

۴۔ کسی طالب کو اگر کوئی ایسی کتاب کہیں سے مل گئی، جس کا کاتب کوئی معلوم محدث ہو تو اسے وجادہ کہا جاتا ہے، اس میں طالب وجدت بخط فلاں (میں نے فلاں کے قلم سے لکھا ہوا پایا)، لکھکر ہی روایت کر سکتا ہے، ایسی صورت میں اخبرنی فلاں (مجھے فلاں نے خبر دی)، کے الفاظ سے روایت کرنا جائز نہیں۔[۵۳]

۵۔ کسی محدث نے بوقت وفات یا بوقت سفر کسی کو وصیت کی کہ میری یہ کتاب

---

[۵۱] الالماع للقاضی عیاض، ص ۶۹-۷۹، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، ص ۲۵۶-۲۶۱، للمحدث الفاضل الرامہرمزی، ص ۴۳۰ مقدمۃ ابن الصلاح، ص ۱۴۳-۱۴۴، الباعث الحثیث لاحمد محمد شاکر ص ۱۱۹-۱۲۱ توضیح الافکار للامیر الصنعانی، ج ۲ ص ۲۹۵-۲۹۰ [۵۲] الالماع للقاضی عیاض، ص ۸۰، الکفایہ للخطیب ص ۳۳۰ توضیح الافکار للامیر، ج ۲ ص ۳۲۹ [۵۳] المحدث الفاضل الرامہرمزی، ص ۴۵۳-۴۵۸، الالماع ص ۳۴۹ علوم الحدیث لابن الصلاح، ص ۱۶۰، ۱۶۴-۱۶۷، الباعث الحثیث، ص ۱۲۷، تدریب الراوی للسیوطی، ج ۲ ص ۴۴-۴۲، توضیح الافکار للامیر الصنعانی، ج ۲ ص ۳۴۳۔

یا کتابیں فلاں شخص کو دی جائیں تو اسے وصیۃ بالکتاب کہا جاتا ہے، متقدمین ایک فریق صرف وصیت سے موصی لہ کے واسطے ان کتابوں سے روایت کرنا جائز سمجھتا ہے، مگر جمہور اس کی اجازت نہیں دیتے۔[۵۴]

۶۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا "میں نے فلاں شہر والوں کو اجازت دی" اس میں چونکہ ایک قسم کا انحصار ہے، اس بناء پر اس شہر والوں کو اس سے روایت کرنا درست ہے۔[۵۵]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین نے چند معمولی احتیاط کے ساتھ ہر ممکن صورت میں علم کے ابلاغ اور کتاب کی نشر و اشاعت کی سعی بلیغ کی ہے، اسی لئے محدثین کے یہاں کتب خانوں کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور میں زنادقہ کے تخریبی ادب سے بھی کتابوں کی اشاعت بڑھی تھی، زندیقوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھکر ملحدانہ نظریات کی اشاعت کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر کتابیں نہایت نفیس کاغذ، بہترین سیاہی اور بہترین خط میں لکھوا کر کھلی مارکیٹ میں لانے لگے تاکہ ان کی کتابیں نفاست، خوبصورتی اور حسن خط کی وجہ سے بازار کتب، کتب خانوں اور شائقین کتب کے گھروں میں پہنچیں اور اہل علم کی مرکز توجہ بنیں، اس طرح ان کے افکار و نظریات کی تشہیر ہوتی تھی۔

اشاعت کتب کی موڈرن ٹیکنیک کی بنیاد عہد عباسی میں

اس ترقی یافتہ دور میں کتابوں کی نکاسی کے موثر ذرائع اور کامیاب ترین ٹیکنیک، بہتر کاغذ کا استعمال، بہتر سیاہی، بہتر کتابت و طباعت

---

[۵۴] الالماع، ص ۱۱۵-۱۱۶، مالا یسع المحدث جہلہ لعمر المیانجی تحقیق صبحی سامرائی، بغداد، شرکۃ الطبع والنشر الاصلیۃ ۱۳۸۷ھ ص، مقدمہ ابن الصلاح، ص ۱۶۶-۱۶۸، المحدث الفاضل الرامہرمزی، ص ۴۵۹-۴۶۰، تدریب الراوی ج ۲ ص ۴۴-۴۴۰، الکفایہ فی علوم الروایہ، ص ۳۵۲۔ [۵۵] الالماع ص ۱۰۴۔

اور دیدہ زیب گیٹ اپ (Get-up) خوبصورت و پائیدار جلد کی داغ بیل عہد عباسی کے اوائل میں زنادقہ کی سرگرمیوں سے معراج کمال کو پہنچ گئی تھی، جاحظ کا بیان ہے،

"زنادقہ کی کتابیں بہترین سفید کاغذ پر نہایت عمدہ سیاہی سے بہت نفیس خط میں لکھی جاتی تھیں[۵] حالانکہ ان کی کتابیں علم و حکمت سے خالی ہوتی ہیں، نہ ان میں کوئی کہاوت ہوتی ہے نہ کوئی اچھی بات ملتی ہے، نہ کوئی ادبی صفت پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی حکمت و فلسفہ ہوتا ہے، نہ کوئی کلامی مسئلہ ان میں نظر آتا ہے، نہ کسی صنعت کی تعریف ہے نہ کسی اوزار کے بنانے کی ترکیب لکھی ہے، نہ کھیتی باڑی کی تعلیم ہے، نہ فن حرب کی تدابیر سے بحث ہوتی ہے، نہ مذہبی مناظرات سے کوئی تعرض ہوتا ہے وہ نور و ظلمت کے ذکر سے بھری ہوتی ہے شیاطین کی افزائش نسل کی داستان جن و بھوت کے جنسی طریقوں کے بیان سے پُر ہوتی ہیں، یہ سب فضول، بیکار باتیں ہیں، خرافات ہیں، ہنسی ٹھٹے کے قصے ہیں، ان میں نہ کوئی اچھی نصیحت ملتی ہے، نہ کوئی دلچسپ خبر، نہ معاش کی تدابیر سے بحث ہوتی ہے، نہ سیاست عامہ کا ذکر اور نہ کوئی خاص ترتیب پر وہ مبنی ہوتی ہیں اب دیکھو کونسی کتاب سب سے زیادہ جاہل رکھنے والی ہے۔[۶]

لغو اور مخرب اخلاق لٹریچر پر پابندی

اسلامی تعلیمات پر مبنی ادب کی حفاظت اس کی ذخیرہ سازی شریعت کی رو سے نہایت پسندیدہ اقدام ہے، یہ حالات کے پیش نظر کبھی فرض و واجب کبھی مستحب اور کبھی مباح ہوتی ہے، جس ادب سے قوم میں تفرقہ و اختلاف رونما ہونے کا خطرہ ہو[۷] یا وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتا ہو، اسے پروان چڑھانے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، ایسے گمراہ کن ادب پر پابندی لگائی جاتی ہے، اسے کوئی تباہ کرتا ہے تو اس پر شرعاً جرمانہ بھی نہیں آتا۔[۸] کیونکہ اس قسم کے لٹریچر سے معاشرہ بگڑتا ہے

---

[۵] كتاب الحيوان، للجاحظ، ج ا ص ۵۵، ضحى الاسلام لاحمد امين ج ا ص ۱۰۰، الجاحظ كتاب الحيوان ج ۱ ص ۵۱

[۷] الطرق الحكمية في السياسة الشرعية لابن القيم تحقيق محمد جميل غازى القاهرة مطبعة المدنى ۱۳۹۶ھ ص ۲۴۳

[۸] ايضاً ص ۲۰۰ [۹] ايضاً ص ۲۹۹

اور لوگوں کی اخلاقی حالت برباد ہوتی ہے، اس وجہ سے علماء زنادقہ کے لغو، مخرب اخلاق اور تخریبی لٹریچر پر پابندی کا حکومت سے مطالبہ کرتے تھے، پھر حکومت ان کی کتابوں کو نذر آتش کراتی تھی یہی وہ زریں و رہنما اصول ہے جس کی بنیاد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلمانوں نے رکھی تھی، اور آج بھی دنیا میں اس پر عمل کیا جاتا ہے، چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی سوقیانہ ادب و مخرب اخلاق کتابوں کی اشاعت کی حکومت اجازت نہیں دیتی، اور ایسی کتابیں قابل ضبطی قرار دیتی ہے، نیز پڑھا لکھا طبقہ بھی اس کو ناقابل التفات سمجھتا ہے، کیونکہ یہ خرافات کا پلندہ ہوتا ہے، اس سے معاشرتی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اسلام نے مسلمانوں کو ان باتوں سے روکا ہے۔

اوائل عہد عباسی کے پسندیدہ و مروج علوم

اوائل عہد عباسی میں حدیث، فقہ، ادب، فلسفہ و حکمت اور صنعت و حرفت سے متعلق علوم کا چرچا تھا، اور اسی قسم کی کتابوں کو پسند کیا جاتا تھا، اس امر کا اندازہ ایک نامور ناقد پاکستانی ابراہیم بن السندی کے زنادقہ کی کتابوں پر تبصرہ سے کیا جا سکتا ہے، وہ کہتا ہے۔

"زنادقہ کی کتابیں ان انواع علوم و معارف سے خالی ہوتی ہیں جن کا عوام میں چلن اور مانگ ہے، وہ حکمت کی فلسفہ کی، فقہ حدیث کی، ادب کی اور رہنمائی کی کتابیں ہیں ایسی کتابیں پسند کی جاتی ہیں جن کا تعلق لوگوں کی صنعت حرفت، تجارت اور کامرس سے، ریاضیات و ارتفاقات سے ہے، یہ علوم میں بیدار مغزی، اور آداب کا موجب ہیں"[۱۰]

ان انواع علوم کے علاوہ دوسری کتابوں پر رقم خرچ کرنا مفید و سودمند نہیں سمجھا جاتا تھا[۱۱]

---

[۱۰] كتاب الحيوان للجاحظ، ج ا ص ۵۴ [۱۱] ايضاً ص ۵۶۔

جو کتابیں مذکورہ بالا معلومات کی حامل نہیں ہوتی تھیں انھیں غیر مفید، مضر و مخرب اخلاق کتابیں تصور کیا جاتا تھا[1]، اور آج بھی ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے اور ان پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔

اسلام میں تبصرہ اسلام میں ائمہ جرح و تعدیل نے تبصرہ کا آغاز کیا، انھوں نے اہل علم کے اخلاق اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے نقد و تبصرہ کیا تاکہ جس حد تک ان سے استفادہ ممکن ہو کیا جا سکے۔ عہد عباسی میں بالغ نظر فن دان، تبصرہ نگاروں کا مختصر تبصرہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اسے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں نقل کیا جاتا تھا جیسا کہ ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل، خطیب کی تاریخ بغداد، سمعانی کی کتاب الانساب، معاجم و اثبات[2] شیوخ اور کتب فہارس سے عیاں ہے، یہ تبصرے اجمالی بھی کئے جاتے تھے، اور تفصیلی بھی، اجمالی، مثلاً علم اور جملہ تالیفات کے متعلق ایک آدھ فقرہ، دوسرے بعض کتاب کے لیے جداگانہ و تفصیلی، ہر کتاب کے لیے جدا تبصرہ ہوتا تھا، اس نوع کے تبصرے تعارف انتخاب کتب و خریداری اور اضافۂ کتب میں رہنمائی کرتے تھے۔

ارباب فن اور ان کے علمی کارناموں پر ابراہیم حربی کا تبصرہ "اہل بصرہ اہل عربیت ہیں، ان میں اصحاب اہوا ہیں مگر چار اصحاب سنت ہیں (۱) ابو عمرو بن العلاء (۲) خلیل بن احمد (۳) یونس بن حبیب (۴) اصمعی"[3] اس تبصرہ کی وجہ سے اہل سنت ان کو سند سمجھتے، ان کی تالیفات پر اعتماد کرتے انھیں جمع کرتے اور کتب خانوں کی زینت بناتے تھے، حافظ حمیدی کا علوم و کتب پر تبصرہ علم علل کے موضوع پر سب سے بہتر دار قطنی کی کتاب اور علم المؤتلف والمختلف پر بہترین تصنیف امیر ابن ماکولا کی ہے، وفیات الشیوخ کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے، میں نے چاہا کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں تو امیر ابن ماکولا نے اس کو حروف معجم پر

[1] کتاب الحیوان للجاحظ ج۱ ص ۵، [2] تاریخ بغداد للخطیب ج۱ ص ۲۱۸، [3] معجم الادباء، ج، ص ۵۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔ ج۴ ص ۱۲۲۰۔

ترتیب دے کر سنین پر مرتب کر دیا[1]۔

انفرادی کتاب پر اجمالی تبصرہ مثلاً خطیب کا بیان ہے کہ میں نے کتاب التاریخ ابن ابی خیثمہ سے زیادہ فوائد کے اعتبار سے کوئی کتاب نہیں دیکھی[2]۔ یا مثلاً عبداللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا قول ہے کہ ابو حمزہ محمد سکری المتوفی ۱۶۷ھ اور ابن طہمان صحیح الکتب تھے[3]۔ یا مثلاً صاعد بن احمد جیانی کا قول ہے کہ قدیم و جدید علوم میں فن کی جامع تین کتابیں ہیں ایک بطلیموس کی ہیئت افلاک میں، دوسری ارسطاطالیس کی علم منطق میں، تیسری سیبویہ بصری کی الکتاب ہے[4]۔ یا مثلاً ابو علی حسن بن داؤد المتوفی کہتے تھے کہ اہل بصرہ کو حسب ذیل چار کتابوں پر ناز ہے۔ (۱) جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور اس کی کتاب الحیوان۔ (۲) سیبویہ کی الکتاب (۳) خلیل کی کتاب العین اور (۴) حرام و حلال کے ساٹھ ہزار مسائل جنھیں امام محمد نے قیاس عقلی سے لکھا اور لوگوں کو ان سے استغنا نہیں، اور فراء اور ابن الاعرابی کی تصانیف[5]۔

انتخاب و خریداری کتب عہد عباسی میں عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی اور عوامل و محرکات کتب خانہ کے گذشتہ مباحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کتابوں کی خریداری کی معاشرہ میں حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، تحصیل علم کے زمانے میں جبکہ جامعات میں ہر طالب علم کو کتب خانے سے مطالعہ کے لیے درسی و غیر درسی کتابیں مفت مہیا کی جاتی تھیں، طلبہ کو درسی کتابیں خریدنے کی ترغیب دی جاتی، اور خرید کتب کے جذبہ کو ابھارا جاتا تھا[6]۔ علماء نے تصریح کی ہے

[1] کتاب الصلہ لابن بشکوال ج۱ ص ۵۶۰، [2] تاریخ بغداد للخطیب ج۴ ص ۱۶۳ [3] ایضاً ج۳ ص ۱۶۷ - ۲۶۹ [4] معجم الادباء لیاقوت ج۶ ص ۸۲، [5] تاریخ بغداد للخطیب ج۴ ص ۱۷۷، [6] تذکرۃ السامع والمتکلم لابن جماعۃ۔ ص ۱۶۴

کہ اگر کوئی کتاب خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے، تو کتابیں نقل کرنے میں وقت صرف نہیں کرنا چاہیے، اور نہ کتاب کو عاریت پر لینا چاہیے۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ درسی کتب کو خریدنے کے اصول کی بنیاد عہد عباسی میں رکھی گئی تھی۔

عہد عباسی میں اہل علم کو کتابیں خریدنے سے قلبی مسرت ہوتی تھی، وہ کتابوں پر "ملکتہا ولله الحمد" (اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے اس کتاب کا مالک بنایا)، اور "النسخۃ عندی ولله الحمد" کے الفاظ لکھ کر اس علمی نعمت کے ملنے پر خدا کا شکر ادا کرتے اور چند توصیفی کلمات کہہ کر اپنے شوق و روحانی مسرت کا اظہار کرتے تھے۔[2] اگر کوئی عالم کسی اچھے خطاط و ضابط کی لکھی ہوئی کتاب کا مالک ہو جاتا تو وہ گویا، شاہ آل بویہ سے مقابلہ کرتا تھا۔[3] یہ کتابوں کی خریداری سے اعتنا کی دلیل ہے۔[4]

کتابوں کی خریداری کوئی اپنے لیے کرے یا کسی ادارے کے لیے خریدے وہ ان اصول کو ملحوظ رکھتا تھا، جن کا تذکرہ "گراں قیمت کتب" کے زیر عنوان کیا گیا ہے، انتخاب و خریداری میں انہی اقسام کی کتابوں کو ترجیح دی جاتی تھی، ذاتی، سرکاری و عوامی کتب خانوں میں بعض کتابوں کے کئی کئی، بعض کے دہائیوں،[5] اور بعض کے سینکڑوں کی تعداد میں نسخے جمع کئے جاتے تھے۔[6]

عہد عباسی میں پانچویں صدی ہجری میں کتابوں کی خریداری اتنی بڑھ گئی تھی کہ کتابوں کے خریدنے (Acquisition) سے پہلے پانچ رہنما اصول کو سامنے رکھا جاتا تھا

---

[1] تذکرۃ السامع والمتکلم لابن جماعہ، ص ۱۶۴، [2] انباء الرواۃ للقفطی، ج ۴ ص ۱۵۰،۳۰
[3] ایضاً ص ۱۴۹، [4] تذکرۃ السامع والمتکلم ص ۱۶۴ [5] الخطط المقریزیہ ج ۲ ص ۳۴۴
[6] ایضاً

(۱) ان کے اول و آخر اور درمیانی حصے کو دیکھا جاتا۔ (۲) ابواب اور کراسوں کی جانچ پڑتال کی جاتی چنانچہ امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ فرماتے تھے کہ کتاب کو دیکھا کرو اس میں (۳) الحاق (۴) اصلاح و (۵) وصحت کے آثار پاؤ تو یہ اس کی صحت کی دلیل ہے اور بعض علماء کہتے تھے کہ کتاب میں روشنی اصلاح و درستی سے آتی ہے۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب خرید کتب میں مذکورۂ بالا رہنما اصول کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے عہد عباسی میں صحت و ضبط، الفاظ کا درست املاء اور صحیح اعراب ہی قلمی کتابوں کی صحت کا صحیح معیار تھا، تذکرہ نگار ایسے فنکاروں کے تذکرے میں ان کی اس فنکارانہ مہارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس لیے کہ انتخاب کتب میں اس پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، چنانچہ بعض بلاد کے اہل علم کا ضبط پست و کمزور ہوتا تو اس کی نشاندہی کی جاتی تھی چنانچہ ابن الفرضی نے محمد بن احمد قیروانی المعروف بابن الخراز المتوفی ۳۵۹ھ کے متعلق تصریح کی ہے۔

کان خطہ ضعیفاً و ضبطہ کضبط القرویین۔[2]	موصوف کا خط زوردار نہیں تھا ان کا ضبط بھی اہل قیروان کا سا پست درجے کا ضبط تھا۔

اس لئے اس امر کی تصریح کی جاتی تھی کہ فلاں فلاں کی تصحیح کردہ کتابیں حجت و سند میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں، مثلاً ابن بشکوال نے ابوعلی حسین غسانی قرطبی المتوفی ۴۹۸ھ کے متعلق لکھا ہے۔

صحح من الکتب من لم یصححہ غیرہ الحفاظ کتبہ حجۃ بالغۃ۔[3]	موصوف نے کتب حدیث کی اتنی تصحیح کرائی ہے کہ حفاظ میں ان کے علاوہ کسی نے نہیں کرائی، انکی درست کرائی ہوئی کتابیں[3]

---

[1] تذکرۃ سامع و متکلم ص ۱۶۲ و ۱۶۳، [2] تاریخ العلماء والرواۃ لابن الفرضی، طبع مصر، ج ۲ ص ۱۱۳، [3] کتاب الصلہ لابن بشکوال، ج ۱ ص ۱۴۲۔

یا مثلاً ابن الفرضی نے ابوعمر یوسف ملطی المتوفی ۳۳۳ھ کے متعلق لکھا ہے۔

کان حسن الخط، جید الضبط اماماً فی ھذا الفن۔[1]	موصوف اچھے خوشنویس تھے، الفاظ کو اچھی طرح ضبط کرتے تھے اور اس فن میں امام تھے۔

انتخاب و خرید کتب میں مدد کی غرض سے ارباب تذکرہ صاحب طرز خطاطوں کے طرز خط سے واقفیت کی بنا پر ان ارباب کمال کی نشاندہی کرتے تھے، جو استادانِ فن کی تحریریں اور نمونہائے خط اپنے ذخائر میں جمع کرتے تھے، تاکہ وقت ضرورت مقابلہ کر کے خط کو دیکھا جا سکے، چنانچہ ثعالبی نے ابومحمد یحییٰ بن عبداللہ ارزلی بغدادی کے متعلق جو ادیب و شاعر تھا، تصریح کی ہے کہ موصوف کے پاس بغداد میں اس قسم کا ذخیرہ محفوظ تھا۔[2]

صاحب طرز خطاط کی لکھی ہوئی کتاب کو پسند کیا جاتا، یہ گراں قیمت میں ملتی تھی، اس لئے کہ صاحب طرز خطاط اگر کوئی رقعہ کسی امیر کو لکھکر بھیجتا تو انعام سے سرفراز کیا جاتا تھا، چنانچہ فاطمہ بنت علی المعروف بنت اقراع المتوفیہ ۴۸۰ھ جو ابن البواب کی روش پر لکھتی تھی ایک مرتبہ ایک رقعہ لکھکر عمید الملک کو بھیجا تو اس نے انہیں ایک ہزار دینار بھیجے تھے۔[3] اس لئے تذکرہ نگار بسا اوقات صاحب طرز و زود نویس خطاط کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں، تاکہ ان کی بکثرت لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھکر انتخاب و خرید کتب کے موقعہ پر شک نہ ہو، چنانچہ عبدالرحمٰن بن احمد شیرازی المعروف بعطار المتوفی ۴۲۵ھ کے متعلق تصریح کی گئی ہے، کہ موصوف نے اپنے قلم سے ایک ہزار مجلدات لکھی تھیں۔[4] ابوالعرب محمد بن احمد تمیمی المتوفی ۳۳۳ھ حافظ حدیث، فقیہ، زود نویس و بسیار نویس نے ساڑھے تین ہزار کتابیں

---

[1] تاریخ العلماء والرواۃ لابن الفرضی ۲ ص ۲۰۵ [2] تتمۃ الیتیمۃ للثعالبی ج ۲ ص ۱۰۲ [3] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۱۲ ص ۱۳۳ [4] فوات الوفیات لکتبی ۲ ص ۵۵ - ۵۵۰

اپنے قلم سے لکھی تھیں۔[1]

اگر کوئی صاحب طرز خطاط ادیب لغوی و نحوی بھی ہوتا تو اس کی نقل کی ہوئی کتاب کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی، اس کے خریدار زیادہ ہوتے تھے، چنانچہ ابوالحسن علی بن نصر بن نقی مصری المتوفی ۳۸۲ھ کا لکھا ہوا، الجمہرہ لابن درید کا نسخہ جمال یحییٰ بغدادی کے ترکہ میں محکمہ وظائف مصر کے نگراں منقذ تبریزی نے مصر میں بیس دینار میں خریدا تھا، یہ بھی انہیں اس منصب پر ممتاز ہونے کی وجہ سے سستا ملا تھا، ورنہ اس کی قیمت زیادہ ملتی۔[2]

یا مثلاً یاقوت موصلی المتوفی ۶۱۸ھ کا جو اپنے وقت کا نامور ادیب و صاحب طرز خطاط تھا، خط نسخ میں صحاح جوہری کا لکھا ہوا نسخہ سو دینار میں بکتا تھا۔[3] اس وجہ سے ادیبوں کے ساتھ صاحب طرز و نامور خوشنویسوں کا تذکرہ بھی کیا جاتا تھا۔[4] اور جو ارباب کمال مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں خوب لکھتے تھے، (جیسے ابوالحکم ابن غلندہ اشبیلی المتوفی ۵۸۱ھ ان کی نشاندہی کی جاتی تھی۔[5] جو اہل علم اور درست قابل خواندگی خط میں لکھتے تھے، مثلاً قاضی ابوجعفر محمد بن اسحاق بن علی بجائی زوزنی المتوفی ۴۶۳ھ ادب کی صحیح و قابل خواندگی خط میں کتابیں نقل کرتے تھے۔[6] چنانچہ مورخ عبدالغافر فارسی نے موصوف کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ثعالبی کی کتاب یتیمۃ الدھر کا نسخہ دیکھا تھا، جو تیس دینار نیشاپوری میں فروخت ہوا تھا، حالانکہ وہ اس سے زیادہ قیمت کا تھا۔[7]

---

[1] طبقات علماء افریقیہ و تونس تالیف ابوالعرب محمد القیروانی تحقیق علی الشابی و نعیم حسن الیافی بیروت، الدار التونسیۃ ۱۹۶۸ء ص ۴۳ (المقدمہ) الدیباج المذہب لابن فرحون ص ۲۵۰۔ [2] انباہ الرواۃ القفطی ج ۲ ص ۳۲۳ معجم الادباء لیاقوت، ج ۵ ص ۲۳۴ - ۲۳۳ (لہ) معجم البلدان ج ۲ ص ۴۴ - بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، جلد ۲ ص ۱۱ [3] وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱۳ ص ۹۶ شذرات الذہب لابن العماد، ج ۵ ص ۱۲۳ [4] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۰، العبر للذہبی ج ۴ ص ۲۶ [5] معجم الادباء ۔ لیاقوت ج ۴ ص ۱۳۱ [6] ایضاً ج ۶ ص ۴۰۸ [7] ایضاً

مذکورۂ بالا واقعہ سے معلوم ہوا کہ جو اہل علم حدیث یا فقہ یا لغت وادب یا اور کسی فن کی کتابیں لکھنے میں ممتاز ہوتے تھے، ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے تھے، اس لئے کہ یہ باتیں انتخاب کتب وخرید کتب (Acquisition) میں اہل علم اور خازنوں کی رہنمائی کرتی تھیں نقطے اور اعراب کو بھی، انتخاب وخرید کتب میں ملحوظ رکھا جاتا تھا، جو ارباب کمال اس فن میں ممتاز ہوتے تھے، انھیں القاقط کہا جاتا تھا[1] نقطے اور اعراب کے لگائے جانے سے کتاب کی زینت وآرایش بڑھ جاتی تھی، اس لئے وہ گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھی، اور انتخاب میں اسے ترجیح حاصل رہتی تھی، چنانچہ کتب تاریخ وسیر میں اہل علم وارباب کمال کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا تھا۔[2]

اس طرح مصور کتاب سے بھی کتاب کی زیب وزینت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے، اسے بھی انتخاب میں ترجیح حاصل رہتی تھی، چنانچہ محمد بن احمد المعروف بابن صابر المتوفی ۶۲۳ھ دواوین کو بالتصویر شائع کرتے تھے۔[3] لیکن بدخط (سقیم الخط)، غلط نویس، بسیار نویس، اہل علم کی نقل کردہ کتاب کو پسند نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے ایسے عالم، ادیب اور نحوی کی اس کمزوری کی طرف بھی ارباب تذکرہ اشارہ کرتے ہیں۔[4] اسی طرح جو عالم وکاتب نقل میں جلدی اور عبارت چھوڑ جاتا تھا اس کی اس کوتاہی کو بھی بتاتے۔[5]

عہد عباسی میں کتب خانوں میں انتخاب وخرید کتب میں کتابوں کے کامل نسخوں کی خریداری پر زور دیا جاتا تھا، لیکن بعض شوقین اور قدردان علم وفن محزوم (سوراخ زدہ) کٹی ہوئی اور معیوب کتابیں بھی خرید کر محفوظ کرتے تھے، اس لیے بعض اوقات محقق کو تحقیق

---

[1] الانساب للسمعانی، ورق ۵۵۱، [2] فوات الوفیات للکتبی، ج۱ ص ۲۱۰، العبر للذہبی ج۵ ص۲۶
[3] الوافی بالوفیات للصفدی، ج۲ ص ۱۱۳، [4] معجم الادباء لیاقوت ج۴ ص ۲۴۲، [5] ایضاً ج۶ ص ۲۴۳

طلب امور ان میں بھی مل جاتے تھے، اور مکمل نسخوں کی غیر موجودگی میں ناقص نسخے بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتے تھے، قاضی فاضل نے اسی مقصد کے پیش نظر اپنے کتب خانے میں مخرومات خرید کر محفوظ کی تھیں[1] لیکن یہ عمل دائمی نہ تھا، اگر کتاب صحیح وسالم اور نقائص سے مبرا میسر آنے کا قوی امکان ہوتا تو مخرومات کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی میں انتخاب وخرید کتب کی یہ دو خصوصیات ہیں جن کی ہم نے تاریخی شواہد کی روشنی میں پہلی مرتبہ نشاندہی کی، ان کا احاطہ کیا، اور انھیں مرتب کیا ہے، یہ دو خصوصیات اور رہنما اصول ہیں جن میں بعض کو اس دور میں بھی (Acquisition) میں اہمیت حاصل ہے۔[2]

مذکورۂ بالا امور سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب وخرید کتب میں مذکورۂ بالا رہنما اصول کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا، چنانچہ مندرجۂ بالا مباحث سے عہد عباسی میں کاغذ سازی، خوشنویسی کتاب سازی وبازار کتب کی علمی وثقافتی حیثیت تجارت کتب کے فروغ کے اسباب، عہد عباسی کے معیاری ناشرین، ارزان وگران قیمت کتابوں کے عوامل، انتخاب کتب کے اصول ومبادی سے بحث کی گئی ہے، جن سے عہد عباسی میں کتاب سازی کے ان مراحل کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، جن سے کتاب کو کتب خانہ میں پہنچنے سے پہلے تیاری میں گزرنا پڑتا تھا، اس سے عہد عباسی میں کتاب سازی کے معیار پر روشنی پڑتی ہے، اس کی استنادی وتحقیقی حیثیت بھی واضح ہو جاتی ہے، اور یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی صنعت کاغذ سازی نے علوم کے ذخائر کو عام کیا، اور کتابیں عوام کے پاس ارزاں ومناسب داموں میں پہنچنے لگیں،

---

[1] کتاب السلوک للمقریزی، ج۱ ص ۹، [2] Wright Howch, A rare book its essential qualifications, library Trends, vol 5, No. 4. April, 1957. P 493-

جہالت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں تعصب واوہام پرستی کا خاتمہ ہوا۔

مسلمانوں نے علم کو مقدس فریضہ سمجھا صنعت وراقت کو عبادت کا درجہ دے کر پروان چڑھایا، اور ٹیکس سے آزاد کر کے ہر کہ ومہ کے استفادہ کے لئے کھلے بازاروں میں فروخت کے لیے رکھا، اس سے کتابوں کی پیداوار میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ علم گھر گھر پہنچ سکا اور بلا امتیاز مذہب وملت ہر ایک کو اس سے فائدہ پہنچا، بنی نوع انسان کی علمی اور تحقیقاتی سرگرمیاں پروان چڑھتی رہیں، علمی وثقافتی ورثہ بآسانی نسلاً بعد نسل تیزی سے سینوں سے سفینوں میں منتقل ہوتا، اقلیموں اور شہروں میں پھیلتا اور پروان چڑھتا رہا، عہد عباسی میں اس کی کثرت ہوگئی تو کتب خانوں میں اس کو جداجدا رکھنے کے لئے انھیں مختلف درجوں میں تقسیم کر کے رکھا گیا، تاکہ اس سے استفادہ آسان ہوسکے اور ذخائر میں ہم آہنگی کے ساتھ ترتیب قائم رہے اس ضرورت کے لیے عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں وقتاً فوقتاً علوم میں جو تنظیم وتنسیق کی گئی، اور علوم کو حسب ضرورت جن اہم شعبوں میں تقسیم کیا گیا تعمیم وتخصیص، توزیع وتقسیم کا جو عمل رونما ہوا وہ تنظیم (classification) کے نام سے موسوم ہے۔

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

مولانا شبلی نعمانیؒ پر ایک نظر

اس میں حیات شبلی مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی کی روشنی میں مولانا شبلی کے مختصر سوانح حیات کے علاوہ ان کی تمام اہم تصنیفات، ان کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سیاسی اور فلسفیانہ مضامین کے مجموعوں، ان کی زندگی کی اہم ترین مقدس کتاب سیرۃ النبیؐ، خطبات، مکاتیب اور کلیات فارسی واردو کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ کیا گیا ہے، از۔ سید صباح الدین عبد الرحمن۔ قیمت ۱۵ روپے

اساتذہ مولانا فراہیؒ

از۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، اسلام آباد،

یہ درست ہے کہ جب تک کسی کے اندر جوہر ذاتی نہ ہو فقط اوپر کی تعلیم وتربیت سے کچھ نہیں ہوتا، شعاع ہر شبنم کو اوپر اٹھا لیتی ہے، مگر نہال چمن کی ایک نونہال پتی کو نہیں اٹھا سکتی۔

نہ اٹھا جذبہ خورشید سے اک برگ گل تک بھی ہے یہ رفعت کی تمنا جو اڑا لیتی ہے شبنم کو

لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ کتنے ہی جوہر قابل ذاتی صلاحیت کے باوجود اس لیے برباد ہو جاتے ہیں کہ ان کو پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت کا صحیح ماحول میسر نہیں آتا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ابر نیساں سے برسنے والے پانی کی ہر بوند، سیپ کے پیٹ میں پرورش پانے سے پہلے خود بخود موتی بن جاتی لیکن معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

مولانا فراہیؒ کو مبدء فیاض نے ایک طرف دل ودماغ کی فطری صلاحیتوں سے نوازا تو دوسری طرف انھیں اپنے وقت کے بہترین اساتذہ کی مدد اور رہنمائی انتہائی سازگار ماحول میں حاصل ہوئی بچپن سے لے کر عنفوان شباب تک کا زمانہ جو تعلیم وتربیت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے قابل رشک حالات میں گذرا، انھوں نے ایک مثالی طالب علم کی حیثیت سے مثالی اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کر کے یہ وقت بسر کیا جیسا کہ ہم تعلیم کے باب میں تفصیل سے ذکر کر آئے ہیں، ان کی تعلیم کا یہ دور محض اس لحاظ سے ممتاز نہیں تھا، کہ اس کے ہر ہر مرحلے پر انھیں اپنے فن میں یکتا وبیگانہ مشاہیر علماء ہند کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، بلکہ اس کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ

اوّل سے آخر تک انھوں نے انفرادی توجہ کے سایہ عاطفت میں اپنی تعلیم کمل کی، ابتدا سے لیکر تکمیل تک وہ اپنے ہر استاد کی بارگاہ ادب میں تنہا بیٹھے نظر آتے ہیں، تعلیم و تعلم کے اس طریقے میں جو خیر و برکت ہے وہ ظاہر ہے، اس سے تعلیم کی ترقی کی رفتار ہی نہیں اس کے معیار پر بھی خوشگوار اثر مترتب ہوتا ہے اور انسان اجتماعی تعلیم کی جملہ خرابیوں سے یکسر محفوظ رہتا ہے، اس کے لیے اچھی بری صحبت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا سن رشد کو پہنچتے تک اپنے لائق اور شفیق اساتذہ کی نگرانی میں زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک صالح نوجوان کا روپ دھار لیتے ہیں، ان میں دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتیں ان کے روشن مستقبل کی غمازی کرتی ہیں، طالب علم کی حیثیت سے وہ اپنے اساتذہ کے لیے سرمایہ افتخار ثابت ہوتے ہیں، جہاں وہ اپنے اساتذہ پر فخر کرتے ہیں، ان کے اساتذہ ان پر فخر کرتے ہیں۔

مولانا ایک ذہین طالب علم تھے، ذہانت کے ساتھ ان کے مزاج میں سنجیدگی بھی تھی۔ ایسے طالب علم معمولی صلاحیت کے استاذوں سے مطمئن نہیں ہوتے، مولانا کو شروع سے آخر تک جو اساتذہ ملے ان میں کوئی بھی دوسرے یا تیسرے درجے کا استاد نہیں تھا، ان میں سے بعض کے علم و فضل کے بارے میں مولانا کی اپنی شہادتیں بھی ملتی ہیں، جن کے بارے میں مولانا کی شہادت موجود نہیں، ان کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ اوّل درجے کے استاد تھے، مولانا کے اساتذہ میں سے جن کے نام کا علم ہے، ان میں سے ہر ایک نہ صرف یہ کہ اپنے وقت کی ممتاز علمی شخصیت تھا، بلکہ اس کے پیچھے علمی روایات کی ایک تاریخ ہے، جس کے باعث تاریخ میں اس کو شہرت عام اور بقائے دوام کا رتبہ حاصل ہوا، پوری صدی گذرنے کے بعد آج بھی دنیائے علم و ادب میں ان اساتذہ کی عزت و عظمت کا سکہ رواں ہے۔

جیسا کہ تعلیم کے باب میں ذکر کیا گیا، طالب علم کی حیثیت سے مولانا کی زندگی کے دو دور ہیں،

تعلیم کے دوسرے دور میں تصور تعلیم مقصد تعلیم اور منہج تعلیم ہر چیز پہلے دور سے اتنی مختلف ہے، کہ لفظ تعلیم کے سوا شاید ہی دوسری چیز ان دونوں کے درمیان قدر مشترک کہی جاسکے تعلیم کے اس دور میں استاد شاگرد کا وہ تصور بھی مفقود ہے، جس کو انفرادی حیثیت میں زیر بحث لایا جاسکے۔ خاص مشرقی تصور کے مطابق تعلیم کے اس دور میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس کو پہلے دور کے اساتذہ کے دوش بدوش ہم اس باب میں جگہ دے سکیں، دوسرے دور کے برعکس پہلے دور کے تمام اساتذہ بلا استثنا مسلمان تھے، عالم دین تھے، وہ محض استاد نہیں دین اور علم دین کے داعی اور نقیب تھے، مولانا کے ذہنی ارتقاء اور فکری نشوونما میں ان کا حصہ وقیع ہے، مولانا کی شخصیت کا ہیولی تیار کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا، مولانا کے سیرت و کردار پر ان کے دیرپا بلکہ مستقل اثرات ہیں، یہ اثرات مثبت اور تعمیری ہیں، ان میں تواتر اور تسلسل ہے، ان کے ماضی حال اور مستقبل میں کوئی فرق و اختلاف نہیں، ان اثرات نے ملت بیضاء کے ساتھ مولانا کے رابطے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو اور استوار کیا، مولانا اسلامی دنیا کے لیے ایک امام اور فکری مجدد کی صورت میں جلوہ گر ہوئے تو یہ انہی اساتذہ کرام کا فیضان بے احسان تھا، انہیں کے فیض تربیت سے مولانا کے کردار میں وہ پختگی آئی کہ وہ اپنی تعلیم کے دوسرے دور میں مخالف ماحول کی مخالف اثرات سے نہ صرف یکسر محفوظ رہے، بلکہ وہاں سے نکلے تو اپنے رنگ میں پختہ تر ہو کر نکلے، اگر یہ مقولہ درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو تعلیم کے پہلے دور کے اثرات و نتائج جہاں مولانا کی پوری زندگی پر محیط نظر آتے ہیں، وہاں دوسرے دور کے اثرات و نتائج معدوم نہیں تو موہوم نظر آتے ہیں، یہ بات ہم نے مولانا کی شخصیت کے حدود اربعہ کے اندر رہ کر اور ان کی داستان حیات کے اوراق پڑھ کر کہی ہے، جس کے شواہد باب تعلیم میں بکھرے پڑے ملیں گے، لیکن اگر کہیں ہم مولانا کی اپنی تصریحات کی میزان میں رکھ کر ان دونوں ادوار کی قدر و قیمت معلوم کریں

توہیں دوسرے دور کو شاید مولانا کی زندگی ہی سے خارج کرنا پڑے، اس لیے اس دور کے اساتذہ کا ذکر اگر اس باب میں نظر نہ آئے تو کمی محسوس کرنے کے باوجود ہم پر ایک سوانح نگار کی حیثیت سے طرفداری یا بے انصافی کا الزام عائد نہ کیا جائے۔

حافظ احمد علی سکروری مولانا فراہیؒ کے معلوم اساتذہ میں سب سے پہلا نام حافظ احمد علی صاحب ساکن سکروڑ کا ہے، جن کی بارگاہ ادب میں بیٹھ کر مولانا نے قرآن حفظ کیا، اور حافظ ہوئے، نام کے علاوہ حافظ صاحب کے بارے میں خبر اور اثر کی حیثیت سے کچھ نہیں معلوم، حافظ صاحب کا گاؤں میرے گاؤں سے صرف تین میل دور ہے، پہلے اور دوسرے سفر میں مجھے اس کا موقع نہ ملا، لبعد میں ہندوستان جانے کی صورت نہ بن سکی، ورنہ ممکن تھا، کہ ان کے گاؤں جاکر ان کے حالات معلوم کیے جاتے، تاہم قیاس کی مدد سے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آج کے زمانے میں حفظ اور حافظ کے متعلق جو تصورات ہیں وہ ہم لوگوں کے بچپن میں نہیں تھے، اور مولانا کے بچپن میں تو صورت حال اور بھی مختلف رہی ہوگی، اور پھر صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڈھ میں مسلمانوں کی کسی بستی میں روایات اور اقدار کا جو نظام صدہا برس سے قائم ہے، اس میں حافظ اور مولوی کا مقام بہت بلند ہے، مولانا رئیس زادے تھے، مگر انھوں نے سب سے پہلے حفظ کیا اور ایک حافظ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، یہ بات معلوم نہ ہونے کے باوجود یقینی ہے، کہ حافظ صاحب نے مولانا کو ان کے گھر پر کر تعلیم دی، میں نے اپنے بچپن میں بھی اس کی متعدد مثالیں دیکھی ہیں کہ شرفا کے ہاں بچوں کی تعلیم کے لیے جو اساتذہ رکھے جاتے تھے، ان کو استاد کا روایتی ادب و احترام دیا جاتا تھا، انھیں خادم یا ملازم نہیں بلکہ گھر بھر کا استاد سمجھا جاتا تھا، وہاں کی معاشرت میں حافظ ہونا اس بات کی ضمانت تصور کیا جاتا تھا، کہ وہ نیک صالح اور دیندار آدمی ہوگا، حافظ احمد علی صاحب کی شہرت ضلع میں عام ہوگی، ورنہ مولانا کے والد فاصلے کے باوجود ان کا انتخاب نہ کرتے۔

حافظ کی اور حفظ کرانے والے استاد کی جو فضیلت ہے، سب کو معلوم ہے، قرآن کی محبت جو مولانا فراہیؒ کی کتاب حیات کا سب سے جلی عنوان ہے، اس کا بیج سب سے پہلے حافظ احمد علی صاحب نے بویا، مولانا نے اس وقت تک عربی نہیں پڑھی تھی، وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتے تھے، مگر قرآن کے تیس پارے جس شخص کے سینے میں محفوظ ہوں اس کا اثر اس کی زندگی پر نہ پڑے ناممکن ہے۔

مولوی محمد مہدی چاردی مولوی محمد مہدی چاردی مولانا فراہیؒ کے فارسی کے استاد تھے، وہ ضلع اعظم گڈھ کی ایک بستی موضع چارہ کے رہنے والے تھے، جس کا فاصلہ مولانا فراہیؒ کے گاؤں پھریہا سے نسبۃً زیادہ تھا، چارہ ضلع کی ایک معروف بستی ہے، اس کی خاک سے کئی ایسے فاضل اٹھے جن کے نام تذکروں میں ملتے ہیں، لیکن مولوی مہدی صاحب کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے، اپنے شاگرد مولانا فراہیؒ کی طرح وہ بھی گوشۂ گمنامی میں رہے، مولانا فراہیؒ کی شہرت کے بعد ان کے استاد کی حیثیت سے اگر کسی نے اس طرف توجہ کی تو اب بھی ان کے حالات کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتے ہیں[1]، مولوی اور عالم ہونے کے علاوہ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے، ان کے فارسی کلام کا کچھ نمونہ ہم نے تعلیم کے باب میں درج کیا ہے، جس سے نہ صرف ان کی شاعرانہ عظمت بلکہ علمی تبحر خاص کر فارسی زبان و ادب میں ان کی استادانہ مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، اب تک میری نظر میں ان کی سب سے بڑی فضیلت یہی تھی کہ وہ مولانا فراہیؒ کے استاد تھے، مگر ان کی بیاض اور ان کا کلام دیکھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے، کہ اگر وہ مولانا فراہیؒ کے استاد نہ ہوتے تو بھی ان کا علمی و ادبی مقام اتنا بلند ہے کہ انھیں کم از کم اعظم گڈھ کے عام علماء اور شعراء میں خاص جگہ دی جائے: یہ ذکر تو ملتا ہے کہ انھوں نے مولانا فراہیؒ کو فارسی پڑھائی، اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا کی فارسیت تمام تر انھیں کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے،

---

[1] بہرحال مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ آئندہ مجھے ہندوستان جانے کا موقع ملا اور حالات نے اجازت دی تو امید ہے کہ کچھ کامیابی ہو۔

مگر مولانا کو شاعر بنانے میں یا ان کے ذوق شاعری کو ابھارنے اور نکھارنے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے اسکی کوئی شہادت دستیاب نہیں، مگر عقلاً اور عادۃً یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ ان جیسا باکمال مولانا کا استاد ہو اور ان پر مطلق اثر انداز نہ ہو، مولانا نے جس عمر میں ان سے پڑھا اثر پذیری کے اعتبار سے وہ زندگی کا بہت فعال زمانہ ہوتا ہے، لوہا پارس کو چھو جائے اور اس پر سونے کا رنگ نہ چڑھے، یہ ممکن نہیں، مولانا نے ۱۶ برس کی عمر میں متقدمین شعرائے فارسی کے رنگ میں قصیدہ کہنا شروع کر دیا، اس میں مولانا شبلی کی صحبت کے اثر کا اعتراف کر کے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی مہدی صاحب کی تعلیم و تربیت کو بھی ضرور اس میں دخل رہا ہوگا۔ مولانا کی شخصیت کے دو پہلو نہایت نمایاں ہیں علمی اور ادبی، علمی حیثیت سے فائدہ و استفادہ کو غیر یقینی کہہ سکتے ہیں، مگر ادبی حیثیت سے مولانا کی شخصیت کا ہیولیٰ تیار کرنے میں مولوی مہدی صاحب کے اثر و نفوذ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی مہدی صاحب سے استفادہ کا زمانہ اگرچہ کم عمری کا ہے، اس وقت مولانا کی عمر گیارہ بارہ[1] برس سے زیادہ نہ تھی، لیکن اگر سیکھنے والا اور سکھانے والا بیک وقت دونوں اپنی جگہ مستعد اور فعال ہوں تو نتیجہ ہمیشہ غیر معمولی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مولانا کی تعلیمی سرگذشت میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، فارسی زبان میں مولانا کی مہارت اور ان کے شاعرانہ کمالات کا جائزہ بعد کے ابواب میں مناسب مقام پر لیا جائے گا، یہاں موقع کی مناسبت سے ہم اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، کہ مولانا کی زباندانی اور شعر گوئی کی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں مولوی مہدی صاحب کا حصہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے، فی زمانہ جب کہ فارسی کا ذوق ختم ہو چکا ہے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ شاید نہ لگایا جا سکے، مگر آج سے سو سال پہلے جب کہ فارسی برصغیر کی علمی زبان تھی، پڑھا لکھا کہلانے کے لیے فارسی جاننا لازمی تصور کیا جاتا تھا، شرفاء کے گھروں میں

فارسی بولی جاتی تھی، بقول سجاد صاحب کے لوگ فارسی عربی پڑھ کر وکیل منصف اور جج بن جاتے تھے، اور انگریزی کی نمط ابھی اس کا سکہ رواں تھا صورت حال آج سے بہت مختلف تھی، مجھے موقع ملا تو میں استاد فراہی مولوی محمد مہدی چتاروی کے حالات جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔[1]

مولانا شبلی نعمانی

مولانا فراہی کے اساتذہ میں مولانا شبلی کا نام اتنا بڑا ہے کہ ان کے وصف میں کچھ لکھتے ہوئے مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا احساس ہوتا ہے، اس میں بڑائی کی جہتیں دو ہیں ایک تو خود مولانا شبلی کی بھاری بھرکم شخصیت کا حجم معنوی دوسرے مولانا فراہی کے ساتھ باعتبار کم و کیف ان کے تعلق کی خصوصی نوعیت، سو پہلی جہت کے متعلق یہاں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کہ کتابی صورت میں ان کے حالات سے واقفیت کے لیے "حیات شبلی" کے ہزار صفحات پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اور ان کے کارناموں سے براہ راست واقفیت کے لیے تنگی داماں سے گلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، علاوہ ازیں میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے قارئین کی اکثریت جامع الصفات مولانا شبلی کی گوناگوں علمی جہات سے پہلے ہی بخوبی واقف ہوگی البتہ دوسری جہت کے تعلق سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس نوع کے مطالب کے لیے ہم نے "فراہی اور شبلی" یا "شبلی اور فراہی" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب مختص کر دیا ہے۔ کہ مواد کی افراط اسی کی مقتضی تھی، اس لیے اس باب میں محض خلا کو پر کرنے کے لیے مختصر ذکر ضروری سمجھا گیا، چونکہ اس باب میں مولانا شبلی کا ذکر فراہی کے استاد کی حیثیت سے ہے، اس لیے گفتگو کو اس دائرے تک محدود رکھنا ضروری ہے، مولانا شبلی نے

---

[1] جس وقت مجھے یہ منصوبہ تفویض کیا گیا تھا، خود فراہی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر اب میرا جی چاہتا ہے کہ مولوی مہدی صاحب پر بھی زیادہ نہیں تو ایک اچھا سا سوانحی مضمون لکھ کر ان کی فضیلت آپ کو خراج تحسین پیش کروں۔

فراہی کو بالکل نجی طور پر پڑھایا، درسیات کی تکمیل کے بعد جب تک عملی زندگی کی کوئی مصروفیت شروع نہیں ہوئی، مولانا شبلی کنبے اور قرابت کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے، ان پڑھنے والوں میں سب سے نمایاں نام مولانا فراہی کا ہے، مولانا شبلی نے اپنے نامور اساتذہ کی نگرانی میں درس نظامیہ کی تکمیل کی، اور وہی متداول علوم انھوں نے مولانا فراہی کو پڑھائے، عربی اور اسلامی علوم کی بنیادی تعلیم تقریباً مکمل کرائی، مولانا شبلی خود ایک ذہین اور طباع انسان تھے ان کو شاگرد بھی ویسا ہی ذہین اور طباع ملا، خوش آئند نتیجہ نکلنا لابدی تھا مولانا شبلی کی تربیت میں مولانا نے تیزی سے ترقی کے مدارج طے کیے، مولانا شبلی کی ذات میں مولانا کو ایک فاضل استاد ہی نہیں شفیق مربی بھی ملا، اساتذہ فراہی میں صرف مولانا شبلی کی ایک ذات ایسی ہے، جس سے انھوں نے کسی ایک مضمون میں نہیں کئی مضمونوں میں استفادہ کیا، اور اس اعتبار سے مولانا شبلی کی مدت افادہ بھی دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ ہے، مولانا فراہی نے اپنے جن اساتذہ کا نام لیا ہے ان میں مولانا شبلی کا نام سب سے نمایاں ہے، مولانا شبلی کا نام جس طرح مولانا فراہی کی زبان پر آتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں ان کے لئے انتہائی عزت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے، اسی طرح استاد کو شاگرد کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا، اس کی مثالیں بھی کم ملتی ہیں، مکاتیب شبلی میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

مولانا شبلی کی تعلیم نے مولانا کو ایک عالم دین کے قالب میں ڈھالا اور وہ بنیادیں استوار کیں جن پر فکر فراہی کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی، مولانا فراہی مولانا شبلی کے ساختہ پرداختہ ہیں، مولانا شبلی کی شاگردی میں رہ کر مولانا نے جو کچھ جس طرح پڑھا اس نے بڑی حد تک مولانا کی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کر دیں، المعلم الامام عبد الحمید الفراہی کی مفکرانہ شخصیت

کی داغ بیل یہیں پڑی، ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ مولانا شبلیؒ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب بھی تھے، یہ نہیں معلوم کہ مولانا نے مولانا شبلیؒ سے کبھی اصلاح بھی لی یا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام بھیجتے تھے، بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مشق کے زمانے میں مولانا فراہیؒ غالباً ان کو اپنا کلام دکھاتے بھی تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں مولانا فراہیؒ نے جب پہلا فارسی قصیدہ کہا تو اس وقت وہ اعظم گڈھ میں مولانا شبلیؒ سے پڑھتے تھے، اس لیے لازم ہے کہ وہ مولانا شبلیؒ سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے ہوں گے، بہرحال اتنا طے ہے کہ مولانا شبلیؒ کی صحبت سے مولانا کو فائدہ پہنچا، مولوی مہدی صاحب کے بعد مولانا شبلیؒ بھی ان کو ایک ایسے استاد ملے جو اپنی جگہ ایک مانے ہوئے شاعر ادیب اور نقاد تھے، جس زمانہ میں مولانا طالب علم کی حیثیت سے ان کے پاس مقیم تھے، ان کی شعری وادبی صلاحیتوں کو آپ سے آپ اشتعال ملی ہوگی۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی | مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ کے درس میں مولانا فراہیؒ کی شرکت خود مولانا کی تصریحات سے ثابت ہے، اس کی مدت خواہ کتنی ہی قلیل رہی ہو مولانا نے اپنے اساتذہ میں ان کا ذکر کیا ہے، مولانا عبد الحئی فقہ اور اصول فقہ کے استاد تھے، فقہ بہرحال ہماری دینی تعلیم کا ایک اہم جزء ہے۔ مولانا شبلیؒ سے متوسطات پڑھنے کے بعد مولانا کو تکمیل کا خیال ہوا تو مختلف علوم کے اہل کمال کی تلاش میں رخت سفر باندھا، لکھنو پہنچ کر مولانا عبد الحئیؒ کے حلقہ درس میں بیٹھے، لیکن زیادہ دن وہاں نہیں رہے، مولانا عبد الحئیؒ کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا فراہیؒ کا نام نہیں آتا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باقاعدہ تکمیل نہیں کی اور فراغت سے پہلے چلے آئے، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے، کہ مولانا فراہیؒ نے فرنگی محل سے کیا اثرات قبول کئے، اور وہاں سے وہ کس قسم کے تاثرات لیکر رخصت ہوئے، مولانا کے مسودات میں فقہ اور اصول فقہ سے متعلق بعض نا تمام کتابوں کے نام ملتے ہیں مثلاً، "الرائع فی اصول الشرائع" اور "فقہ القرآن" وغیرہ،

جن کا ذکر "تصانیف" میں اور "افکار" کے ذیل میں آئے گا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ فقہ کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن یہ سمجھنا مشکل ہے کہ علمائے فرنگی محل اور ان کے فقہی مسلک کے بارے میں ان کے خیالات کی نوعیت کیا تھی؟ مولانا امین احسن اصلاحی کے خیال میں جیسا کہ تعلیم کے باب میں گزر چکا ہے، وہ فرنگی محل اور علمائے فرنگی محل سے متاثر نہیں تھے۔

مولانا ارشاد حسین رام پوری مولانا ارشاد حسین رام پوری کا شمار وقت کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے، مولانا شبلیؒ نے ان سے پڑھا تھا، مگر مولانا فراہیؒ کا استفادہ کسی دلیل قطعی سے ثابت نہیں، بعض راویوں نے برہنائے قیاس اس خیال کا اظہار کیا ہے، اس لیے جب تک تحقیق سے یہ ثابت نہ ہو جائے، کہ مولانا نے کچھ وقت ان کی خدمت میں بھی گزارا، ان کا ذکر اس باب میں برائے بیت بھی ہو سکتا ہے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری مولانا فراہیؒ کے اساتذہ میں مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ بھی اپنے دور کے اہل کمال میں سے تھے، اور اپنے فن میں تو وہ یکتائے روزگار تھے، ان کا خاص میدان عربی ادب اور قرآن مجید ہے، ان کی تصانیف میں یہی دو مضمون نمایاں ہیں، پڑھاتے وہ عربی ادب تھے، خاص کر ادب جاہلی پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، برصغیر میں شعرائے جاہلیت اور کلاسیکی ادب کو متعارف کرانا ان کا خاص کارنامہ ہے، مولانا فراہیؒ نے ان سے عربی ادب کی تکمیل کی، انھوں نے اعظم گڑھ سے لاہور تک کا سفر اسی مقصد سے کیا۔ مولانا فراہیؒ میں کلام جاہلیت سے دلچسپی ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، مولانا فراہیؒ استاد کی حیثیت سے ان کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتے ہیں، مولانا سہارنپوری کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ عربی میں بے تکلف شعر کہتے تھے، ان کا عربی دیوان موجود ہے، جس میں ہر طرح کا کلام ہے، اغلب ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے مولانا فراہی عربی شاعری کی طرف مائل ہوئے،

لاہور جانے سے پہلے وہ فارسی میں شعر کہتے تھے، مولانا سہارنپوری کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ عربی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے، ان کا عربی دیوان چھپ گیا ہے استاد اور شاگرد کے کلام کے تقابلی مطالعہ سے کچھ مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ تعلیم کے دوسرے دور میں مولانا فراہیؒ کے اساتذہ میں صرف یہی ایک نام ہم تک پہنچ سکا، مڈل اور میٹرک کا زمانہ تو یوں ہی مجہول ہے، ایم اے او کالج علی گڑھ کی چار سالہ مدت تعلیم بھی، اس لحاظ سے سپاٹ ہے، کہ اس زمانے کے اساتذہ بالکل مفقود الخبر ہیں، مولانا نے اس دور کی تعلیم کا تو ذکر ایک آدھ جملے میں کہیں کیا ہے، مگر اس دور کے اساتذہ میں سے کسی ایک کا بھی ذکر ان کی اپنی زبان سے سننے میں نہیں آیا حتی کہ پروفیسر آرنلڈ کا بھی انھوں نے استاد کی حیثیت سے کہیں نام نہیں لیا ہے۔ مولانا کے زمانہ طالب علمی میں مولانا شبلیؒ علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے، لیکن چونکہ وہ عربی فارسی پڑھاتے تھے، اور مولانا ان مضامین سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، اس لیے کالج میں مولانا شبلیؒ کی شاگردی کا اتفاق نہیں ہوا، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کالج میں فلسفہ کے استاد تھے، اور مولانا فراہیؒ نے ان سے فلسفہ جدیدہ میں استفادہ کیا، لیکن اس روایت کو ماننے میں کچھ اشکالات ہیں، جن کا ذکر ہم نے تعلیم کے باب میں کیا ہے، جن لوگوں نے آرنلڈ سے مولانا کے استفادہ کا ذکر کیا ہے، نہیں معلوم یہ ان کا قیاس ہے یا کسی سند سے ان تک یہ بات پہنچی۔ پروفیسر آرنلڈ کا ذکر اساتذہ فراہی کے باب میں ہم نے ایک مسئلہ کے طور پر شامل کر دیا ہے، جو تحقیق طلب ہے۔

تعلیم اور اساتذہ فراہی کے ذکر کے بعد عملی زندگی کے حالات سے پہلے بعض ان واقعات کا ذکر ضروری ہے جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بیٹے کی پیدائش ۱۸۹۳ء | مولانا کے صاحبزادے سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۸۹۳ء میں مولانا فراہیؒ کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام حماد تھا، شادی کے نو سال بعد بیٹے کی پیدائش ہوئی جو یقیناً خوشی کا باعث ہوئی ہوگی، مولانا فراہیؒ اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے، علی گڑھ میں وہ صاحب کتاب پہلے ہی بن چکے تھے، اب صاحب اولاد بھی ہوگئے، مولانا کے والد حاجی عبد الکریم صاحب زندہ تھے، انھوں نے پوتے کا عربی نام مرزا رکھا جو بعد میں حماد ہوگیا۔

استاد کی وفات ۱۸۹۶ء | اسی زمانے میں مولانا فراہیؒ کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا انتقال ہوا، شاگرد کو استاد سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اظہار ایک مرثیے کی صورت میں ہوا۔ افسوس کہ یہ مرثیہ نایاب ہے۔

معارف:۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حالات اور کارناموں پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں، یہ مضمون اسی کا ایک حصہ ہے اس لیے اس میں کہیں کہیں گذشتہ اور آئندہ ابواب کے حوالے بھی مذکور ہیں۔

حیات شبلی

یہ کتاب محض علامہ شبلی مرحوم کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک کے ہندوستان کی مذہبی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور اس دور کی اور بہت سی تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ ہے، شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اہمیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے۔ اس میں علامہ کے تلمیذ مولانا فراہیؒ اور ان کے بعض اساتذہ کا بھی تذکرہ ہے۔ جو خود علامہ شبلیؒ کے بھی استاذ تھے۔

قیمت:۔ ۴۸ روپے

"منیجر"

وفیات

آہ مولوی محمود الحسن

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

اس مہینہ کے معارف کی طباعت ختم ہو رہی تھی کہ یکایک خبر ملی کہ مولوی محمود الحسن ناظم انجمن تعلیمات دین اپنے بچوں، عزیزوں اور قدردانوں کو چھوڑ کر اب وہاں ہیں جہاں نیکوں، پاکبازوں، صفاکیشوں کو سرور جاودانی اور حیات ابدی ملتی ہے، ان کی دائمی جدائی پر کچھ آنکھیں نمناک اور اشکبار ہوں گی، لیکن انجمن تعلیمات دین کے کارکنوں اور ہمدردوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو بھی جاری ہوں گے تو اس سے ان کی دائمی رحلت کی غمناکی اور دردناکی دور نہ ہو سکے گی، ان کی وفات کچھ ایسا ہی جاں گسل سانحہ ہے۔

وہ انجمن تعلیمات دین کے بانیوں میں سے تھے، ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد چند مردان خدا کی بدولت یہ انجمن قائم ہوئی تو زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی ؎

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے

اس انجمن نے اتر پردیش میں جو کام انجام دیے ہیں، وہ مسلمانوں کی ملی تاریخ کا ایک زریں کارنامہ

ہے، اس کے ذریعہ سے بے شمار دینی مکاتب قائم ہوئے جن سے اتر پردیش کے مسلمان بچوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے ثبات و یقین کا سامان فراہم ہوا، جناب عدیل عباسی مرحوم نے اس کارواں کے یکہ تاز بن کر جس طرح رہبر خوانی کی، اس سے انجمن کا کام بہت آگے بڑھا، ان کے یمین ویسار میں مولوی ظفر احمد صدیقی مرحوم وکیل اور مولوی محمود الحسن رہے، جس سے اس کے کام کو غیر معمولی فروغ ہوا، مصلحت خداوندی سے جناب عدیل عباسی مرحوم اور جناب ظفر احمد صدیقی مرحوم، مولوی محمود الحسن کو تنہا چھوڑ گئے، مگر وہ اس کے لیے عمل پیہم اور یقین محکم بلکہ سوز درون، درد پنہاں اور روح جاں گسل بنے رہے، وہ کسی مجلس میں بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ انجمن تعلیمات دین بیٹھی ہے، وہ بولتے تو انجمن بولتی دکھائی دیتی، سفر کرتے تو انجمن ہی متحرک نظر آتی، ان کی کبر سنی، صحت کی کمزوری، سفر کی دشواری، ان کے عزم بالجزم میں رکاوٹ کبھی نہیں رہی، وہ ہر جگہ پہونچتے، للّٰہیت ان کی راہ نما ہوتی، اخلاص ان کے جلو میں ہوتا، ان کی حرکی قوتیں ان کا ساتھ دیتی رہتیں، جہاں گئے کامران اور کامیاب بن کر واپس ہوتے، ان کے بعد انجمن کی نرگس اپنی بے نوری پر ضرور روئے گی، لیکن اس کے موسسوں کی پاکیزہ نیت، مخلصانہ جذبہ اور خود اس کی افادیت، اس کے کام کو برقرار رکھنے کی ضامن ہے، اور اسی سے اس کے کارکنوں کو نیا حوصلہ ملتا رہے گا، جس سے امید ہے کہ یہ انجمن اپنی پرانی روایات کے ساتھ پہلے ہی کی طرح سرگرم عمل رہے گی، اس کی آواز ویسی ہی اذان بن کر رہے گی، جس سے دل کہسار ہل جاتا ہو، انجمن تعلیمات دین کی جب تاریخ قلمبند کی جائے گی تو مولوی محمود الحسن کی بھی تاریخ لکھی جائے گی، جنھوں نے لالۂ صحرائی بن کر اپنی ؎

خاموشی و دل سوزی و سرمستی و رعنائی

کے ساتھ اس کی خدمت کی، وہ بستی کے ایک معزز خاندان سے تھے، جناب عدیل عباسی کے سگے بہنوئی تھے، مگر ان کی اصلی سوانح عمری یہ ہے کہ وہ انجمن تعلیمات دین کے لیے زندہ رہے، اس کے لیے وفات پائی، اب وہ نہیں رہے، مگر ان کی نیکیوں کی بدولت ان کی ابدی خوابگاہ پر کرم الٰہی کا ابر برابر چھایا رہے گا، ان کے کاموں کی نوعیت، مغفرت کے پھول ان پر نچھاور کرتی رہے گی، آمین، اور ان کی یادیں اس وقت تک باقی رہیں گی، جب تک انجمن کا کام جاری رہے گا۔

مطبوعات جدیدہ

معدن المعانی مترجمہ جناب سید شاہ تسیم الدین احمد شرفی منعمی، فردوسی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۲۴، مجلد مع دلکش گرد پوش، قیمت ۶۰ روپے، پتے (۱) مکتبہ شرف بیت الشرف، خانقاہ معظم بہار شریف، نالندہ (۲) خانقاہ فردوسیہ، ۱۵ لنٹن اسٹریٹ کلکتہ ۱۴ (۳) دار الاشاعت اسلامیہ ۵ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۳۔

مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ، برگزیدہ، عالی مرتبت اور کثیر التصانیف صوفیائے کرام میں وہ پہلے بزرگ ہیں جو صاحب ملفوظات اور صاحب تصنیفات دونوں تھے، ان کا زیادہ اہم بالشان کارنامہ اور ان کے علوم و کمالات اور معارف و حقائق کی اصلی یادگار ان کے مکتوبات ہیں جن کے بعد ملفوظات میں معدن المعانی کا خاص اور اہم درجہ ہے، یہ واقعی اسم بامسمّٰی اور علم و معرفت کے اسرار و حقائق اور سلوک و تصوف کے رموز و نکات کا گنجینہ ہے، اس سے شیخ کے علوئے مرتبت، شریعت و طریقت کی جامعیت، علم و تحقیق کی گہرائی، غوامض و مشکلات کی عقدہ کشائی، مجتہدانہ بصیرت اور کتاب و سنت کے وسیع و عمیق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، ملفوظات کا یہ مجموعہ حضرت کے ایک مرید باصفا حضرت زین بدر عربیؒ نے دو جلدوں میں مرتب کیا تھا، پہلی جلد میں چوبیس (۲۴) اور دوسری میں انتالیس (۳۹) ابواب ہیں، ان ابواب میں صرف تصوف کے رموز و نکات ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ توحید، اسرار دین، تفسیر، حدیث، سیرت نبوی اور فقہ و کلام کے

مباحث بھی آگئے ہیں، چنانچہ ابتداء کے چار ابواب میں علم کلام کے مسائل باری تعالیٰ کے وجود و وحدانیت کے اثبات، ذات و صفات الٰہی، بعض متشابہات مثلاً ید (خدا کا ہاتھ) وجہ (اس کا چہرہ) وغیرہ اور ایمان، اسلام اور کفر کا ذکر ہے، چھٹا باب قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے حفظ کے بیان میں ہے، اس کے بعد کے تین ابواب میں حدیث و سیرت کے بعض مباحث اور چند حدیثوں کے مفہوم و مطلب کی دلنشین اور محققانہ تشریح کی گئی ہے، چند ابواب میں طہارت اور اسلامی عبادات و ارکان نماز، روزہ اور حج و جہاد کے لطیف مباحث پر گفتگو فرمائی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی دکان معرفت میں ہر طرح کے مریضوں کی دوائے دل کا سامان ہوتا تھا، اور وہ اپنی مجلسوں میں تصوف کے لاینحل عقدے بھی حل کرتے تھے، اور وعظ و پند اور رشد و ہدایت کے موتی بھی بکھیرتے تھے، اور لوگوں کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ کی تعلیم اور رذائل و مکارہ سے بچنے کی تلقین بھی فرماتے تھے، اس مجموعہ کی یہ خوبی بھی ہے کہ حضرت شیخ ملفوظات کے آخر میں مناسب اور برمحل اشعار پڑھ کر انھیں نہایت موثر اور دلپذیر بنا دیتے تھے، ان کے دور میں فارسی علمی زبان تھی، اس لیے ان کی تصنیفات اور ملفوظات کی زبان بھی فارسی ہے، خانقاہ معظم نے ان کے اردو ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہے، چنانچہ مکتوبات صدی کا اردو ترجمہ اس سے پہلے چھپ چکا ہے، اب جناب سید شاہ قسیم الدین احمد صاحب نے اردو خواں طبقہ کے لیے معدن المعانی کا ترجمہ شایع کیا ہے، اس کے شروع کے ۹ ابواب کا ترجمہ ان کے استاذ حافظ سید شاہ محمد شفیع مرحوم نے کیا تھا، باقی ابواب کے ترجمہ کی سعادت ان کے حصہ میں آئی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اچھی صلاحیتوں سے نوازا ہے، اور وہ صاحب علم و قلم ہونے کے علاوہ صاحب دل بھی ہیں، اور اسی کے ساتھ حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ سے گہری عقیدت بھی رکھتے ہیں، اور اس سے پہلے وہ ان کے بعض ملفوظات شرح آداب المریدین، مونس المریدین اور فوائد المریدین وغیرہ کے اردو ترجمے کرکے ان کی تعلیمات کو پھیلا چکے ہیں، امید ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر آیندہ بھی حضرت مخدوم صاحبؒ کی تصنیفات کے اردو ترجمے کرکے مزید علمی و دینی خدمت انجام دیں گے، اس برصغیر کے دور دراز گوشوں تک حضرت مخدوم بہاریؒ کی تعلیمات کی جس قدر اشاعت

ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی، امید کہ فاضل مترجم کی مساعی جمیلہ سے یہ کمی پوری ہوجائے گی، جس کے لیے ارباب علم و عرفان ان کے ممنون ہوں گے۔

ممکن ہے اصل کتاب میں خال خال ایسی چیزیں بھی نظر آئیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوں، لیکن ملفوظات کا یہ بیش بہا مجموعہ ہر شخص کے مطالعہ کے لائق ہے، اس کو پڑھ کر ایمان و یقین میں اضافہ اور قلب و روح میں بالیدگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے، کتاب کے آخر میں حضرت مخدوم الملکؒ کی وفات کے سبق آموز واقعات و حالات بھی درج ہیں، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم" سے ماخوذ ہیں۔

سیرت شیخ ابن سینا کے بعض پہلو اور القانون فی الطب کا مطالعاتی جائزہ

از مولانا حکیم محمد زماں حسینی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات مجموعی ۱۰۰، مجلد، قیمت ۱۵ روپیے

ناشر: مجلس القرآن والحدیث ۸۰ کبوتولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۔

مولانا حکیم محمد زماں صاحب کلکتہ کے ایک مشہور و مقبول عالم اور بڑے ماہر و حاذق طبیب ہیں، زیر نظر کتاب ان کے دو محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلا مقالہ جشن ہزار سالہ یوم پیدائش شیخ بو علی ابن سینا کے موقع پر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے سمینار کے لیے لکھا گیا تھا، اور دوسرا مقالہ شیخ کی ہزار سالہ یوم پیدائش کی تقریب کی مناسبت سے ایران سوسائٹی کلکتہ کے سمینار میں پڑھا گیا تھا، ان دونوں مضامین میں نامور حکیم و فلسفی شیخ بو علی ابن سینا کے علم و فضل اور سیرت و کردار کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، اور ان کی شہرہ آفاق اور فن طب کی مہتم بالشان کتاب "القانون فی الطب" پر مفید بحث و گفتگو کی گئی ہے، پہلے مقالہ میں شیخ اور ان کی مذکورہ بالا مایۂ ناز تصنیف کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے، پھر القانون کی روشنی میں شیخ کی سیرت و شخصیت کی نمایاں اور سبق آموز خوبیاں پیش کی ہیں، آخر میں شیخ کی مے نوشی کی مشہور روایت کی دلائل سے تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ وہ ایک مرد مومن کے اوصاف و خصوصیات کے مالک تھے، دوسرے مقالہ میں "القانون فی الطب" کے متعلق ضروری اور مفید معلومات تحریر کرکے اس کی اہمیت دکھائی ہے، اور اس کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراضات کا

تحقیقانہ جواب دیا ہے، پھر نفس کتاب کے مندرجات سے علاج معالجہ میں شیخ کی جدت فکر، نادر بیماریوں کی تشخیص اور فن طب کی دوسری مفید اور قیمتی باتوں کا تذکرہ کیا ہے، آخر میں شیخ کی طبی تصانیف کی ایک اجمالی فہرست دی گئی ہے، اور قانون کی مختلف اشاعتوں، اس کے مختلف زبانوں میں تراجم، اس کی شروح، تحشیات اور تلخیصات کے شروح و تراجم کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں مقالے علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، اور ان سے جہاں شیخ کی عظمت، عبقریت، جودت طبع، عمدہ سیرت اور ان کی فاضلانہ تصنیف "القانون فی الطب" کے بارے میں اہم معلومات فراہم ہوتے ہیں، وہاں علم الادیان و علم الابدان میں خود مصنف کی مہارت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے خلف الرشید مولوی حکیم محمد عرفان حسینی ان مقالوں کی اشاعت پر اہل علم خصوصاً فن طب سے اشتغال رکھنے والوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

نئی عرب دنیا:۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۲ مجلد مع گردپوش، قیمت تیس ۳۰ روپیے، پتہ:۔ مکتبہ طیبہ سی ۲۰۷/۴۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ ۳

اس کتاب میں جدید عرب دنیا کا مختصر تعارف چھ ابواب میں کرایا گیا ہے، پہلے باب میں عرب دنیا کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے عرب کی جغرافیائی، تاریخی، معاشی، تمدنی اور مذہبی اہمیت دکھائی گئی ہے، اسی باب میں مصر پر نپولین کے حملہ کے اثرات کا ذکر بھی آگیا ہے، جس کی بنا پر عربوں میں قومی و سیاسی بیداری پیدا ہوئی، دوسرے باب کے ایک حصہ میں ایشیائی عرب ملکوں سعودی عرب[1]، شمالی[2] و جنوبی یمن[3]، عمان[4] متحدہ عرب امارات[5]، قطر[6]، بحرین[7]، کویت[8]، اردن[9]، لبنان[10]، عراق[11] اور فلسطین[12] کے بارے میں نئے معلومات پیش کیے گئے ہیں، اور دوسرے حصہ میں آٹھ افریقی عرب ملکوں کا تذکرہ ہے، مصر[1]، لیبیا[2]، تونس[3]، الجزائر[4]، مراکش[5]، سوڈان[6]، جمہوریہ موریتانیہ[7] اور صومالیہ[8]، لائق مرتب نے پہلے ان سب ملکوں کے موجودہ مکمل نام دیے ہیں، اور ان کی مختصر قدیم تاریخ بیان کی ہے، پھر ان کے سربراہ مملکت اور دارالسلطنت کے نام، ان کا رقبہ، ان کی آبادی اور اہم شہروں کا ذکر کرکے ان کے علمی، تعلیمی اور دینی حالات و کوائف تحریر کیے ہیں، اسی باب میں عام اسلامی ملکوں کی پیداوار

اور عالمی پیداوار میں ان کے حصہ کا ذکر بھی ہے، اس سلسلہ میں عرب کے علاوہ مسلم اکثریت کے غیر عرب ملکوں اور ان کے دارالسلطنت کے نام، ان کا رقبہ، مسلم آبادی کا تناسب اور عربوں کی خاص پیداوار پٹرول کا تخمینہ دیا ہے، ایک باب میں جدید دنیائے عرب کی چار بڑی تحریکوں وہابی، سنوسی، الاخوان المسلمون اور مہدوی کے مقاصد و خدمات اور اثرات و نتائج وغیرہ کی تفصیل درج ہے، ایک اور باب میں جدید عہد کے ان اصحاب علم و ادب کے حالات و خدمات پیش کیے گئے ہیں، جن کے فکری رجحانات و میلانات بڑی حد تک عربوں پر اثر انداز ہوئے، یعنی شیخ عبدالوہاب، جمال الدین افغانی، خیرالدین تونسی، علی باشا مبارک، عبداللہ ندیم، سید عبدالرحمن کواکبی اور شیخ محمد عبدہ، پانچواں باب موجودہ اہم اداروں اور درسگاہوں کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، اس میں جامع ازہر، عرب لیگ، رابطہ عالم اسلامی، تنظیم اسلامی کانفرنس، خلیجی تعاون کونسل کی نوعیت اور خدمات کا تذکرہ ہے، چھٹے باب میں مغربی ملکوں کی ریشہ دوانی سے فلسطین پر اسرائیل کے جارحانہ تسلط کا ذکر ہے، اس کتاب سے جدید عرب دنیا کے متعلق گوناگوں ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور اس سے ان کے موجودہ رجحانات اور سیاسی، دینی، علمی، تعلیمی، ادبی، فکری، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے واقفیت ہوتی ہے، یہ موضوع اب بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی نے ان کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے اس میں اختصار کو مدنظر رکھا ہے، وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ ہیں، اور ایک عرصہ تک عرب میں قیام پذیر رہ چکے ہیں، اس لیے وہ موجودہ عرب دنیا سے یک گونہ باخبر ہیں، اور انھوں نے یہ کتاب خوش سلیقگی سے لکھی ہے۔

فارسی ادب بعہد تغلق سلاطین: مرتبہ ڈاکٹر شعیب اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۴۴ قیمت ۵۰ روپیے۔ پتے:۔ (۱) اردو بازار جامع مسجد دہلی (۲) یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

یہ ڈاکٹر شعیب اعظمی ریڈر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا تحقیقی مقالہ ہے، جس کو انھوں نے حذف و اضافہ کے

بعد کتابی صورت میں شایع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں تغلق حکومت کے قیام سے لے کر اس کے خاتمہ تک کے عام واقعات و حالات اجمال کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے برسر اقتدار آنے کی روداد بھی بیان کی گئی ہے، اور اس کے اور دوسرے تغلق سلاطین کے علمی و ادبی ذوق اور علم و ادب کی سرپرستی، نیز سیاسی، تاریخی اور تمدنی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اسی باب میں عہد تغلق کی خودمختار ریاستوں کا ذکر بھی ہے، دوسرے باب میں تغلق سلاطین کے دور کے مذہبی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں علماء اور مذہبی طبقوں سے ان کے تعلقات کا خاص طور پر تذکرہ ہے، تیسرا باب تصوف پر لکھی جانے والی اس دور کی اہم کتابوں کے تعارف و تبصرہ کے لیے خاص ہے، اس ضمن میں متعدد کبار صوفیہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ، شیخ حسن سنجریؒ، برہان الدین غریبؒ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حمید قلندرؒ، امیر خوردؒ، شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، اور سید جلال الدین جہانیان جہاں گشتؒ وغیرہ کا تذکرہ بھی قلمبند کیا ہے، اور ان کی تصنیفات اور مجموعۂ ملفوظات پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، چوتھے باب میں فارسی کی اہم نثری تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، اور پانچواں باب اس عہد کی شاعری کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں اہم شعری مجموعوں کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، چھٹے باب متفرقات میں مختلف عمارتوں کے کتبات پر درج اشعار نقل کیے گئے ہیں، یہ کتاب عہد تغلق میں فارسی زبان و ادب کی نمایاں اور اہم خدمات کا مرقع ہے، لائق مصنف نے اس دور کے اکابر صوفیہ، ممتاز نثر نگاروں اور مشہور شعراء کے حالات و کمالات کا مختصر خاکہ بھی دیا ہے، اور ان کی اہم مصنفات و کتب پر تبصرہ کر کے ان کی قدر و قیمت اور اہمیت بھی دکھائی ہے، اس سے دور تغلق کے عام علمی، تعلیمی اور سیاسی و تمدنی حالات کے علاوہ گوناگوں قسم کے مفید معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، یہ کتاب مصنف کی تلاش و محنت اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی اور شیفتگی کا نتیجہ ہے،

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

نوٹ :۔ معارف کا زر سالانہ اور ڈرافٹ یا چیک دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے روانہ فرمائیں۔ "منیجر"